بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ(90)جون-2025 جلدنمبر18

Tahreek-e-adab vol-18, issue-90 June 2025

Editor مدیر

Jawed Anwar (Dr.Jawed Ahmad) جاویدانور(ڈاکٹر جاوید احمد)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہء اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہء اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہء عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہء کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہء اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہء اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہء اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان،،اشتیاق احمد،عرفان عارف،ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

Vol-18(جلدنمبر 18) Year of Publication 2025 سال اشاعت:

Issue June 2025، شمارہ 90۔جون شمارہ نمبر

Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi سرنامہ خطاط:انور جمال

Title cover Uzma Screen, Varanasi عظمیٰ اسکرین سرورق :

فی شمارہ : 200/-Two Hundred rs. per copy دوسو روپے

زرسالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087
State Bank Of India,Branch-Shopping
centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔
Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔
Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

مضامین:

1۔تدریس غزل: مفہوم، مقاصد اور مراحل	امتیاز احمد	5
2۔"میٹھا زہر" کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ	محمد شاہد پٹھان	13
4۔مقصود احمد تبسم کی نعت گوئی "نعتیہ روایت کے آئینے میں"	ڈاکٹر جاوید احمد	33
5۔متنوع برادری کو با اختیار بنانے اور ان کے علمی ورثہ کے تحفظ میں ٹکنالوجی کا کردار	اوساما نسیم، ڈاکٹر طیبہ نازلی	39
6۔کشمیر! یہ وادی مجھ سے کچھ کہتی ہے	افشانہ غمگین بشیر	52
7۔شکیل الرحمن کی ادبی خدمات	محمد فاروق عالم	55
8۔غزل کو سائنسی فکر سے مزین کرنے والا شاعر: ایم۔جے۔خالد	انجینئر محمد عادل فراز	60
9۔پروین شاکر: نسائی احساس کی شاعرہ	زاہد احمد بٹ	71
10۔گوجری تہذیب وثقافت	شازیہ ممتاز	76

افسانے:

1۔وہ زلیخا، بھنگی	وحشی سعید	82
2۔تب دوپہر تھی	نور شاہ	88
3۔نہ جھکنے والا تنا	پروفیسر اسلم جمشید پوری	94
4۔پیڑ سے بچھڑی شاخ	نجمہ عثمان	100
5۔کانپور سے واپسی	فاضل شفیع بٹ	107

افسانچے:

1۔آن لائن، بڑا آدمی، نامعلوم	ڈاکٹر نذیر مشتاق	113

Mansoor Alam (Senior Tadrees-e-Ghazal : Mafhoom, Maqasid aur Marahil by Imtiaz Ahmad (Assistanat. Prof. I.A.S.C. Faculty of Education, Jamia Millia Islamia, New Delhi) cell-9911752717

امتیاز احمد (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تربیتِ اساتذہ و نیم رسمی تعلیم (آئی۔اے۔ایس۔ای۔)، فیکلٹی آف ایجوکیشن، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

تدریسِ غزل: مفہوم، مقاصد اور مراحل

غزل اردو شاعری کی ایک مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ اس کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے متعلق باتیں کرنا ہے۔ یہ واحد ایسی صنفِ سخن ہے جو غمِ ذات، غمِ جاناں، اور غمِ جہاں کو ایک ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کا بنیادی موضوع معاملاتِ عشق اور وارداتِ دل کی مختلف کیفیات کی ترجمانی ہے۔ اس کے علاوہ یہ زندگی کے متنوع پہلوؤں، فلسفیانہ موشگافیوں، سماجی و معاشرتی احساسات و مبادیات، تاریخی واقعات اور عمرانی نظریات سے متعلق موضوعات کو بھی پیرائے اظہار عطا کرتی ہے۔ غزل ان تمام معاملاتِ زندگی اور مبادیاتِ حیات کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال کر اور ایک ایسے رنگ میں رنگ کر پیش کرتی ہے جو اس کی انفرادیت اور مقبولیت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر دور میں عوام و خواص، امیر و غریب، صوفی و رند، زاہد و قلندر اور بڑے بوڑھے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

غزل کی دل ربائی اور کیف و سرور کے ہمہ گیر تاثیر سے بہرہ ور ہونے کے لیے ایک قاری اور سامع کو جہاں ایک طرف اس کے داخلی رموز و علائم سے کما حقہ واقف ہونا ضروری ہے وہیں دوسری طرف اس کے خارجی پہلوؤں سے آشنائی بھی لازم ہے۔ داخلی رموز و علائم میں موضوع و مواد، ایمائیت و اشاریت اور صنعتوں کے استعمال غزل کے معنوی جہاں کو وسعت اور بلندی عطا کرتا ہے جبکہ خارجی پہلو یعنی وزن، بحر، قافیہ، ردیف، مطلع اور مقطع کا برمحل استعمال غزل کی جاذبیت، تاثریت اور مقبولیت کو چار چاند لگاتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنے معنی کے لحاظ سے آزاد، خود مکتفی اور قائم بالذات ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنے سے پہلے اور بعد والے شعر سے الگ اپنی معنوی پہچان رکھتا ہے یعنی اپنے معنی

میں کسی سے اشتراک نہیں کرتا لیکن اگر کوئی مضمون یا خیال ایک شعر میں ادا نہیں ہو پاتا ہے اور شاعر اسے دو یا دو سے زیادہ اشعار میں تسلسل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور غزل کے ان مسلسل اشعار کی حیثیت قطعے جیسی ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان اشعار کو قطعہ بند کہا جاتا ہے۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ غزل کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ البتہ غزل جس قدر مقبول رہی ہے اسی قدر معتوب بھی رہی ہے۔ کبھی اس کے مضامین کو ہدفِ ملامت بنایا گیا تو کبھی اس کی ایمائیت و اشاریت کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ انہی اعتراضات کی وجہ سے اسکولی تعلیم میں غزل کی تعلیم و تدریس کو کارِ زیاں اور مخربِ اخلاق قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اسکولوں کے اردو نصاب میں غزل کی شمولیت پر مندرجہ ذیل اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں:

کلاسیکی غزل فارسی زبان کے الفاظ و تراکیب پر مشتمل ہے جن سے اسکولی طلبہ واقف نہیں ہیں۔

غزل کے بہترین سرمایہ اسکولی طلبہ کی فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔

غزل طلبہ کے مادی ماحول، سماجی حقائق اور روزمرہ زندگی کے مشاہدات و تجربات سے مطابقت نہیں رکھتی ہے۔

غزل کا معتد بہ حصہ عاشقانہ بوالہوسی سے متاثر ہے۔ اس کا مطالعہ اسکولی طلبہ کے اخلاقی اور جذباتی بگاڑ کا سبب بنے گا۔

اسکول کے ثانوی سطح کے طلبہ کے لیے غزل کی تعلیم و تدریس مناسب نہیں ہے۔

غزل کی تدریس کے حوالے سے مذکورہ بالا اعتراضات سے چشم پوشی نہیں کیا جا سکتا مگر یہ بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ غزل اردو شاعری کے تمام سرمائے کا باعتبار معیار و مقدار غالب اور حاوی حصہ ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں غزل کو نصاب میں شامل نہ کیا جانا خود صنف غزل کے علاوہ اردو ادب اور اردو طلبا تینوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اردو نصاب میں غزل کی شمولیت کے لیے ایک انتخابی اصول تیار کیا جائے جس کو یوں وضع کیا جا سکتا ہے۔

الف۔ وہ اشعار جو بہت زیادہ فلسفیانہ یا عالمانہ ہوں۔

ب۔ وہ اشعار جن میں فارسیت زیادہ ہو۔

ج۔ وہ اشعار جو ابوالہوسی، فحاشی یا اخلاق شکنی کے تابع ہوں۔

د۔ وہ اشعار جو عشق و محبت کے جنسی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوں۔

مذکورہ بالا خصائص سے متصف غزلیات کو نصاب سے خارج کر دیے جائیں اور اس کی

تعلیم ثانوی درجات سے پہلے شروع نہ کی جائے۔غزل میں چوں کہ ہر شعر بجائے خود مکمل ہوتا ہے۔ اس لیے اشعار کے انتخاب میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوگی۔

تدریسِ غزل کے مقاصد: غزل افہام وتفہیم سے زیادہ محسوس کرنے اور کیف وسرور سے محظوظ ہونے کی چیز ہے اس لیے اس کی تدریس کے مقاصد بھی ادب کی دوسری اصناف سے مختلف ہیں۔ دوسری اصناف کی تدریس میں لسانی مہارتوں کی نشو ونما، ذخیرۂ الفاظ کا اکتساب، معلومات میں اضافہ اور اظہار خیال کی صلاحیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔جبکہ غزل کے تدریسی مقاصد میں زبان شناسی کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق اور شعری محاسن کی ترویج، شعری مہارت کی تربیت، غزل کے رموز وعلائم سے آشنائی، شاعروں کی فنی عظمت سے آگاہی اور حسن شناسی ولطف اندوزی شامل ہیں۔انہیں مدنظر رکھتے ہوئے نصاب کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ مطلوبہ اہداف بآسانی حاصل کیا جا سکے۔اختر انصاری تدریسِ غزل کے مقاصد پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادبی لطف اندوزی کے کم از کم معنی یہ ہوں کہ طلبہ اشعار کی اندرونی موسیقی کی گونج اپنے ذہنوں میں محسوس کریں، شاعر نے جو مناظر جھلکائے ہیں ان کے رنگ ونور اور کیف وسرور کو محسوس کریں۔ خوبصورت الفاظ اور حسین تراکیب کی مدد سے جو تصویری پیکر تیار کیے گئے ہیں، ان کو اپنی چشم تصور کے سامنے جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا محسوس کریں اور جن جذبات اور جمالیاتی تجربات کی ترجمانی کی گئی ہے ان کی تاثیر کو اپنی روح کی گہرائیوں میں موجود پائیں۔غرض یہ سارا کھیل محسوس کرنے کا ہے۔ ادبی لطف اندوزی دراصل ایک جمالیاتی بازآفرینی کا عمل ہے جو سراسر ذاتی اور شخصی احساس پر مبنی ہے جس میں استاد کی طول طویل تشریحات، تفصیلی تبصرے، موشگافیاں، توجیہیں اور تجزیے اکثر وبیشتر لاطائل اور دوراز کار ثابت ہوتے ہیں۔''

غزل کے تدریسی مقاصد کے حصول کے لیے پُر اثر بلند خوانی اور پر لطف پیش کش کا استعمال طلبا میں ادبی حسن شناسی اور لطف اندوزی کا احساس زیادہ مؤثر انداز میں پیدا کر سکتا ہے۔ استاد غزل کی تدریس کے دوران طلبا کی نفسیاتی سطح اور ذہنی آمادگی کو ملحوظ رکھے تاکہ سبق میں طلبہ کی شرکت اور دلچسپی کو یقینی بنانا آسان ہو۔ بعد ازاں طلبا کی یہی دلچسپی اور سبق میں ان کی شرکت اس بات کا ثبوت ہوگا کہ طلبا غزل سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور ان میں ادبی حسن شناسی اور شعر فہمی کی آبیاری ہو رہی ہے۔

قبل از تدریس کے اہم نکات: کسی بھی مضمون کے استاد کو سبق کی تدریس کے لیے ایک خاص تیاری کی

ضرورت ہوتی ہے۔ایک لائق وفائق استاد بھی پڑھائے جانے والے سبق کو بغیر پڑھے کمرۂ جماعت میں داخل ہونے اور فی البدیہہ تدریس کا تصور نہیں کرتا ہے ۔ جو استاد مختلف موضوعات کو عمر بھر پڑھاتے رہتے ہوں اور ان میں اچھی دسترس بھی رکھتے ہوں وہ بھی تیاریِ سبق کے فرض سے چشم پوشی نہیں کر سکتے ہیں۔سبق کی عدمِ تیاری کی صورت میں ایک استاد کو دورانِ تدریس قدم قدم مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایک مؤثر اور نتیجہ خیز تدریس کے لیے ضروری ہے کہ سبق کی تدریس سے پہلے مندرجہ ذیل مراحل کو ملحوظ رکھنا اور ان کو عملی جامہ پہنانا ازحد ناگزیر ہے۔ پڑھائے جانے والے سبق کے موضوع، اس کی تفصیلات اور جملہ متعلقات سے مکمل واقفیت ایک استاد کو چاہیے کہ وہ مجوزہ سبق کے ہر ایک پہلو اور گوشہ کا اچھی طرح مطالعہ کرے تاکہ وہ تدریس کے دوران کسی قسم کے بے اعتمادی کا شکار نہ ہو۔

مقاصدِ سبق کی تشکیل: ایک استاد کو پڑھائے جانے والے موضوع پر کامل دسترس کے حصول کے بعد اپنے ذہن میں مقاصدِ سبق کا ایک واضح تصور قائم کر لینا چاہیے تاکہ خود اعتمادی اور انبساط کے ساتھ قدم سبق کی تدریس ممکن ہو۔

مقررہ مقاصد کی روشنی میں سبق کے متن و مواد کا انتخاب:

ایک استاد کا ذہنی سرمایہ اور اس کی مجموعی معلومات خاصی وسیع ہوتی ہے اور اس وسیع معلومات کو ایک وقت میں پڑھایا جانا ممکن نہیں ہے۔لہٰذا مقاصد سبق اور وقت کو نظر میں رکھتے ہوئے مفید مواد اور قابل آموزش اجزا کا انتخاب از بس ضروری ہے۔

منتخبہ مواد کی جزوی تقسیم:

پڑھائے جانے کے لیے منتخب مواد یا موضوع اگر طویل ہو تو اسے دو یا دو سے زیادہ ایسے اجزا میں تقسیم کر لینا چاہیے جن میں ہر ایک اپنی جگہ خود مکتفی، قائم بالذات اور مکمل ہو یعنی کسی ایک مرکزی خیال کا حامل یا کسی ایک مسلمہ حقیقت کا ترجمان ہو۔اس جزوی تقسیم سے سبق کے مواد کو چند ذیلی عنوانات کے تحت پیش کرنا ممکن ہو جائے گا اور مواد کو سمجھانے میں بھی آسانی پیدا ہو جائے گی۔

تدریسی طریقہ کار کا انتخاب:

ایک استاد کو مقاصدِ سبق کے تعین، مواد کے انتخاب اور اس کی جزوی تقسیم کے بعد یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ مواد کی پیش کش اور اس کی تدریس کن طریقۂ تدریس کے ذریعے انجام دی جائے گی اور وہ کن تدریسی تدابیر اور حکمتِ عملیوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے گا۔

تدریسی امدادی اشیا کا انتخاب: تدریسی امدادی اشیا سبق کی مؤثر اور نتیجہ خیز تدریس میں بعض اوقات ضروری اور مفید و معاون ثابت ہوتی ہیں۔لہٰذا تدریس سے پہلے ان تمام معاون اشیا کا انتخاب اور اس کی تیاری اچھی طرح کر لینا چاہیے۔

سبق کی مختلف منازل کی ذہنی تیاری:

ایک استاد کو قبل از تدریس کے مذکورہ بالا مراحل کی تیاری کے بعد سبق کی مختلف منازل کی ایک واضح تصور اپنے ذہن میں تیار کر لینا چاہیے اور سبق کی ہر ایک منزل کے لیے مخصوص وقت کا تعین کر لینا چاہیے تا کہ دورانِ تدریس منازل کی بے ترتیبی نہ ہو اور نہ ہی کوئی منزل چھوٹ جائے۔

غزل کی تدریسی منازل: ماہرین تعلیم نے علم و معلومات کی تدریس اور ترسیل کی کامیاب تحصیل کو ایک ایسا ذہنی عمل متصور کیا ہے جو ایک سے زیادہ منازل پر مشتمل اور چند مختلف مگر مربوط مدارجِ عمل سے تعلق رکھتا ہے۔اس نقطۂ نظر سے پڑھایا جانے والا ہر سبق قدرتی طور پر ایک سے زیادہ منازل پر مشتمل ہوتا ہے جن کو تمہیدِ سبق، اعلانِ سبق، متن سبق، بلند خوانی اور اعادۂ سبق جیسے عنوانات سے جانا جاتا ہے۔اردو زبان و ادب کے ماہرین اور ناقدین مثلاً اختر انصاری، محمد حسن اور غضنفر وغیرہ نے تدریس غزل کے مراحل کو کم و بیش آٹھ زمروں یعنی تمہیدِ سبق، اعلانِ سبق، متنِ سبق، تعارفی بلند خوانی، تشریحِ سبق، معلم و متعلم کی معیاری بلند خوانی، استحسانِ غزل اور اعادۂ سبق میں تقسیم کیا ہے۔ تدریسِ غزل کی نتیجہ خیز اور مؤثر تحصیل کے لیے ضروری ہے کہ استاد ان تمام مراحل کا اچھی طرح مطالعہ کرے اور قبل از تدریس ان کی بہتر تیاری کرے۔

تمہیدِ سبق: غزل کی تدریس میں تمہیدی گفتگو کی منزل ایک پیچیدہ اور محنت طلب مرحلہ ہے۔اس منزل سے کامیابی کے ساتھ گزرنا صرف انہی استاد کے لیے ممکن ہو پاتا ہے جو غزل کے جملہ مبادیات، لوازمات اور متعلقات کا گہرا علم رکھتا ہو۔گہرے علم اور عمیق مطالعہ کے فقدان کی صورت میں ایک استاد غزل کی تدریس کے دوران مختلف طرح کے پش و پیش اور مشکلات سے دوچار ہوتے رہتا ہے۔وہ دیکھتا ہے کہ غزل میں ایک بنیادی خیال نہیں ہے، بلکہ اتنے ہی بنیادی خیالات ہیں جتنی کہ اشعار کی تعداد اور بظاہر ایسی کوئی وحدت اور تسلسل نظر نہیں آتا ہے جس کو وہ اختیار کرے اور اس کے سہارے ایک مفید و مؤثر تمہیدی گفتگو کی عمارت کھڑی کر سکے۔

غزل میں اشعار کی ظاہری بے ترتیبی کے باوجود ایک کیفیاتی و جذباتی وحدت اکثر و بیشتر پائی جاتی ہے۔یہ ایک استاد پر منحصر ہے کہ وہ زیرِ تدریس غزل کی اس وحدت کو تلاش کرے اور اس

کے ارد گرد اپنے سبق کی تمہیدی عمارت تعمیر کرے۔اس طرح ایک استاد غزل کی بنیادی وحدت کو موضوعِ گفتگو بنا کر طلبہ کے ذہنی عمل کو بیدار، دلچسپی کو مہمیز، سابقہ معلومات کو تازہ، توجہ کو مخصوص نقطہ پر مرکوز اور اکتسابی عمل کے لیے متحرک اور آمادہ کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے اور ان کی تدریس مؤثر، پرلطف اور نتیجہ خیز بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک استاد غزل کی تمہیدی منزل پر غزل کے مختلف انسلاکات مثلاً اس کی ہیئت، اسالیب، اشاریت و رمزیت، تاریخی ارتقا، موضوعات اور رجحانات و میلانات میں سے کسی ایک کو زیرِ تدریس غزل کی نوعیت کے مطابق منتخب کرسکتا ہے اور تمہیدی گفتگو کے مقاصد کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔غرض یہ کہ غزل سے متعلق بے شمار امور و اور مسائل ایسے ہیں جن سے ایک استاد رجوع کرسکتا ہے اور غزل کے اسباق میں تمہیدی پس منظر کا کام لے سکتا ہے۔

اعلانِ سبق: تدریسِ غزل کے دوران ایک استاد اعلانِ سبق کی منزل پر زیرِ تدریس غزل کے شاعر کا مختصر تعارفی خاکہ، اس کے امتیازات وخصوصیات اور اردو غزل میں ان کا جو مقام و مرتبہ ہے اس کو پیش کرسکتا ہے۔شاعر کے تعارفی خاکہ کی پیش کش کے وقت استاد کو یہ بات ذہن نشیں رکھنا ہوگا کہ وہ غزل کی تدریس کر رہے ہیں نہ کہ شاعر کی سوانحی کوائف کی تدریس۔ استاد شاعر کے تعارفی خاکہ کے بعد متن سبق کی منزل کی طرف گامزن ہوسکتا ہے۔

متن سبق کی تعارفی بلند خوانی:

تمہیدِ سبق اور اعلانِ سبق کی منازل سے گزرنے کے بعد متنِ سبق کی پیش کش کی منزل آتی ہے جو بذاتِ خود ایک سے زیادہ ذیلی منازل پر مشتمل ہوسکتی ہے۔سب سے پہلے زیرِ تدریس غزل کی تعارفی بلند خوانی کی جائے گی تاکہ طلبہ کو غزل کی نوعیت اور مفہوم کا سرسری اندازہ ہوجائے۔غزل کی تعارفی بلند خوانی کے وقت یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ غزل کے مطالعے سے طلبہ کی حسن شناسی اور لطف اندوزی کا انحصار استاد کی بلند خوانی پر ہوتا ہے یعنی استاد جس قدر اچھی اور مؤثر بلند خوانی کے ذریعے مفہوم کی عکاسی پر قادر ہوگا اسی قدر طلبہ کے لیے زیرِ تدریس اشعار سے مستفید اور محظوظ ہونا ممکن ہو گا۔ایک مؤثر استاد بننے کے لیے ضروری ہے کہ اسے بلند خوانی کی بہت اچھی مشق اور سمجھ ہو اور بلند خوانی کے ذریعے اشعار کے مفہوم اور طلبہ میں جمالیاتی و شعری ذوق کی ترویج کا ہنر رکھتا ہو۔

تشریحِ اشعار: استاد تعارفی بلند خوانی کے بعد مختلف اشعار کی تشریح و توضیح کرے گا۔ چنانچہ وہ اشعار کے مفاہیم و مطالب کے متعلق طلبہ سے سوالات کرے گا اور سوالات و جوابات کے دوران میں نہ صرف اشعار کے مفاہیم کو واضح کرے گا بلکہ وہ ضمناً مشکل الفاظ، تراکیب اور محاورات کی تشریح بھی

کرے گا۔ استاد کو مشکل الفاظ، تراکیب اور محاورات کی توضیح اس انداز سے کرنا چاہیے کہ یہ عمل تشریحِ اشعار کا ایک جز و معلوم ہو اور طلبہ کو یہ محسوس نہ ہو کہ اشعار کے مفاہیم و مطالب سے ہٹ کر الفاظ کی تشریح اور تراکیب کی توضیح کی جارہی ہے۔ مشکل الفاظ، تراکیب اور محاورات کی تشریح بھی اسی صورت میں کرنی چاہیے جب استاد یہ محسوس کرے کہ شعری محاسن کی خاطر خواہ توضیح بعض لفظوں کے معنی بتائے اور تراکیب کی تشریح کیے بغیر ممکن نہیں تو وہ سبق کے اصل موضوع اور مقصد سے انحراف کیے بغیر اور غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کرتے ہوئے یہ عمل انجام دے سکتا ہے۔ غزل کی تدریس کے دوران مشکل الفاظ، تراکیب اور محاورات کی تشریح و توضیح اس انداز میں ہونی چاہیے کہ تفہیمِ اشعار بھی ہو جائے اور اشعار میں مستعمل الفاظ و تراکیب اور محاورات کے معنی خود بخود واضح ہو جائیں۔ اگر استاد ایسا کرنے پر قادر نہ ہو تو پھر وہ طلبہ کو براہ راست ان کے معنی بتا دے تا کہ ادبی لطف اندوزی اور جمالیاتی قدر شناسی کے عمل میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہو۔

استحسانِ اشعار: استاد کو اشعار کی توضیح و تشریح کے ساتھ ساتھ ادبی حسن شناسی اور استحسانِ شعر کا عمل بھی جاری رکھنا چاہیے۔ استاد کو طلبہ کے ذہنی معیار و صلاحیت اور ادبی ذوق و شوق کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان تمام ذرائع کو بروئے کار لانا چاہیے جن سے زیرِ تدریس اشعار کے فنی و شعری محاسن اجاگر ہوں اور طلبہ کے لیے ادبی حظ اندوزی اور حسن شناسی کا باعث بنے۔ استاد استحسانِ اشعار کی منزل پر غزل میں مستعمل صنائع و بدائع کی مختلف صنعتوں جیسے تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ، تضاد، تجنیس اور تلمیح وغیرہ کو اس کی مختصر تعریف کے ساتھ واضح کرے گا اور ان صنعتوں پر مشتمل دیگر اشعار کی مثالیں بھی پیش کرے گا۔

معیاری بلند خوانی: استاد استحسانِ اشعار کی منزل سے گزرنے کے بعد پوری غزل کی معیاری بلند خوانی کرے گا۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ طلبہ کے سامنے معیاری بلند خوانی کا ایک نمونہ رکھا جائے اور طلبہ سے یہ امید کیا جائے کہ وہ استاد کی معیاری بلند خوانی سے اچھی طرح لطف اندوز ہوں اور اس کے بعد بذاتِ خود بھی بہتر سے بہترین انداز میں بلند خوانی پیش کر سکیں۔ استاد متعدد طلبہ سے غزل کی بلند خوانی کرنے کو کہے گا اور ہر بچے کی بلند خوانی کے بعد تلفظ کی غلطیوں، لب و لہجہ اور لحن و آہنگ کی خامیوں کی اصلاح کرے گا۔

اعادۂ سبق: استاد تدریسِ سبق کے اس منزل کو مفید اور کارگر بنانے کے لیے اپنے ذہن میں زیرِ تدریس غزل سے متعلق ایسے جامع سوالات تیار رکھے جو غزل کے بنیادی پیغام، عام فضا، غالب

رجحان اور مجموعی کیفیت کو محیط ہوں۔ استاد ان سوالات کی مدد سے غزل کے مختلف و متفرق عناصر کا ایک جامع تصور طلبہ کے سامنے اجاگر کرنے میں کامیاب ہونے کے علاوہ سبق کو ایک جامع و سالم فکری وحدت کی صورت میں پیش کرنے پر بھی قادر ہو سکے گا اور اپنی تدریس کو بامِ عروج پر پہنچا سکے گا۔

کتابیات:

1۔ اختر انصاری، غزل اور غزل کی تعلیم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2012
2۔ محمد حسن، ادبیات شناسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 2000
3۔ رضی حیدر، اردو ادب کے تدریسی دریچے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2009
4۔ رضیہ تبسم، آموزشِ اردو، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، 1980

☆☆☆

"Meetha Zaher" ke Afsano ka Tanqidi Jaeza by Mohd. Shahid Pathan (Jaipur

محمد شاہد پٹھان (جے پور) cell-9372843907

"میٹھا زہر" کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی صوبۂ جموں کشمیر کی نئی نسل کے ایک فعال قلمکار ہیں۔ان کا شمار ادب کے اصلاحی واخلاقی تصور کے حامل ادیبوں میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر وانی کو ترقی پسندی اور جدیدیت کی کمزوریوں اور انتہا پسندیوں کا پورا گیان دھیان ہے، چنانچہ انھوں نے ہر طرح کی ادبی فارمولا بازی اور ادعائیت سے محتاط رہتے ہوئے اپنے تخلیقی اور تنقیدی اصول قائم کیے ہیں۔اپنی مرجح سماجی اور ادبی اقدار کی روشنی میں وہ کئی برسوں سے اپنے تخلیقی وتنقیدی سفر پر گامزن ہیں۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو اُردو کے افسانوی ادب اور اس کی تفہیم وتنقید سے خاص دلچسپی رہی ہے، انھوں نے ''تقسیم ہند کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' (۲۰۰۲) کے موضوع پر کامیاب تحقیقی مقالہ (برائے پی۔ایچ۔ڈی۔) تحریر کیا ہے جو مطالعے سے تعلق رکھتا ہے۔ناول کی مانند اردو افسانہ کی تخلیق وتنقید سے بھی ڈاکٹر وانی کو خاص رغبت ہے۔گزشتہ سولہ سترہ برسوں سے جہاں وہ افسانے لکھتے آئے ہیں، وہیں بعض افسانہ نگاروں پر انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے معاصر زندگی کا جو منظر نامہ دیکھا ہے، اسے ایک حقیقت پسند فنکار کی حیثیت سے اپنے افسانوں کا موضوع ومرکز بنانے کی سعی کی ہے۔وہ ادب کا ایک افادی، اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، چنانچہ ان کے حیات افروز افکار ونظریات کا اظہار ان کے بیشتر افسانوں میں ہوا ہے۔میرے خیال سے تخلیق کی تفہیم میں قاری کی فعال حیثیت برحق، مگر تخلیق کار کے معتقدات کی اہمیت سے بھی یکسر انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، کسی بھی ادبی متن اور ڈسکورس سے ادیب کے افکار و اقدار اور نصب العین کو منہا کر کے معتبر تنقید وجود میں نہیں آسکتی، لہٰذا ڈاکٹر وانی کے افسانوں کی تفہیم کے دوران بھی ہمیں اس امر کو ذہن میں رکھنا ہوگا، تبھی ان کے افسانوں کا معقول مطالعہ کر سکتے ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں جو موضوعات، مسائل اور مباحث سامنے آئے ہیں، ان میں معاصر زندگی کا آشوب واضطراب کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔آج کے انسان اور سماج

کی زندگی ،جس قدر پیچیدہ اور مسائل بداماں ہے، شاید اس سے پہلے کبھی نہیں رہی ہوگی، اور اس پُرمصائب حیاتِ اجتماعیہ کا جس قدر اظہار معاصر افسانے میں دیکھنے کو ملتا ہے، اتنا شاعری میں نظر نہیں آتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ شاعری میں احساسات و تاثرات کے بیان میں ایجاز اور اشارات و علائم کو زیادہ دخل ہے، جب کہ افسانہ اپنے بیانیہ اسلوب میں زندگی کے متنوع مسائل اور واقعات و کیفیات کو ہمہ جہتی کے ساتھ سمیٹنے میں کسی قدر کامیاب رہتا ہے۔ ڈاکٹر وانی کے افسانوں کے موضوعات مختلف الجہات ہیں۔ ان کے افسانوں میں مذہبی، سماجی، سیاسی، نفسیاتی اور اقتصادی ہر قسم کے مسائلِ حیات کا بیان ملتا ہے۔ انہوں نے ایک حقیقت نگار کہانی کار کے طور پر اپنے نقطۂ نظر سے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

''میٹھا زہر'' سے قبل ڈاکٹر وانی کا ایک افسانوی مجموعہ ''ہزاروں غم'' (۲۰۰۱) شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے جو چودہ (۱۴) افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل کہانیوں میں بھی مصنف کا سیاسی و سماجی شعور بیدار نظر آتا ہے۔ چند ایک رومانی کہانیوں کے علاوہ بیشتر کہانیوں کے موضوعات عصری معاشرے میں اُبھرنے والے متنوع مسائل کو محیط ہیں۔ اس اعتبار سے ''تباہی کا دروازہ''، ''مکار''، ''تنہا پرندہ''، ''توبہ''، ''میں سوچتا ہوں''، ''ہزاروں غم''، ''شفاخانہ''، ''خونی رشتے''، ''حلق میں اٹکی چیخ'' وغیرہم قابلِ مطالعہ افسانے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر وانی ایک باشعور، حساس، اور انسانیت دوست کہانی کار کے طور پر قاری کو متاثر اور متوجہ کرتے ہیں۔ ''میٹھا زہر'' میں شامل بارہ افسانوں میں سے بیشتر افسانے اپنے موضوع اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہی نہیں، بلکہ قابلِ توجہ بھی ہیں۔ بعض کہانیوں میں ڈپٹی نذیر احمد کے تعلیمی اور اصلاحی موضوعات و اسالیب اپنائے گئے ہیں اور کچھ افسانوں میں پریم چند کی افسانوی روِش سے بھی استفادہ کیا ہے۔ آزادی کے ساٹھ برس گزرنے کے باوجود ہمارے ملک میں بہت سے دیہی علاقوں میں زندگی کی بنیادی سہولیات مہیّا نہیں ہو سکی ہیں۔ روزمرہ زندگی میں خاص اہمیت رکھنے والی سہولیات مثلاً غذا، دوا، سڑک، بجلی، پانی، تعلیم اور دیگر سامانِ راحت سے لاکھوں انسان ہنوز محروم ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے جموں کشمیر کے پسماندہ علاقوں، خصوصاً دیہات کے عوام کو درپیش مختلف حوائل و مسائل کے بیان میں خصوصی دلچسپی لی ہے۔ اس ضمن میں جناب دیپک بدکی (جن کا تعلق بھی جموں کشمیر سے ہے) نے صحیح لکھا ہے:

۔۔۔۔''مشتاق احمد وانی کے ماحول کے بارے میں قیاس آرائی کرنا بہت مشکل ہے، اس علاقے کی زبوں حالی اور کسمپرسی دیکھتے ہی بنتی ہے، ریاست جموں کشمیر تو ویسے بھی پسماندگی کے لحاظ سے صفِ

اول میں گنی جاتی ہے، پھر ڈوڈہ کا علاقہ تو سب سے زیادہ نظر انداز ہوتا رہا ہے، جیسے اتنا کچھ کافی نہ تھا کہ پچھلی دو دہائیوں سے اس علاقے کو دہشت گردی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور یہاں کے باشندے ایک جانب دہشت گردوں سے جوجھتے رہتے ہیں اور دوسری جانب پولیس کی یاتنائیں سہتے رہتے ہیں''۔(میٹھا زہر۔ص:۳۵)

چنانچہ ''میٹھا زہر'' میں شامل ''جنم بھومی کے آنسو'' اور ''دوہری مار'' نامی افسانوں میں وادیِ کشمیر کے ارضی حقائق ومسائل کا کماحقہ اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔

''جنم بھومی کے آنسو'' مشتاق احمد وانی کا ایک اہم افسانہ ہے، اس میں انھوں نے مقامی کرداروں کے حوالے سے جموں کشمیر کی گزشتہ دو دہائیوں میں بدلتی ہوئی سیاسی وسماجی صورتحال اور وہاں کے المناک ماحول کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ لہٰذا افسانے کے ایک کردار (گولو) سے مخاطب ہوتے ہوئے نادر چچا یوں گویا ہوتے ہیں:

''کیا بتاؤں بیٹے تم تو یہاں کے حالات دیکھ ہی رہے ہو، نو سال سے تمھاری جنم بھومی جیسے آگ میں سلگ رہی ہے، اب تو ہمارے دن کا چین اور رات کی نیند ہم سے چھن گئی ہے۔ بیٹے وہ پہلے جیسے مزے اب کہاں کہ آدھی آدھی رات کو چلتے تھے تو کوئی پوچھتا نہیں تھا، لیکن اب تو پورے علاقے پر فوجیوں کا تسلط ہے۔ ان نو برسوں میں بیٹے تمھاری جنم بھومی پر کئی بم پھٹے ہیں، کئی نوجوان مرد عورتیں، بوڑھے اور بچے گولی کا نشانہ بنائے گئے، کتنی ہی بیویوں کے سہاگ اُجڑ گئے اور کتنے ہی ذبح کیے گئے، میرا بیٹا اختیار احمد بھی تو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔''

نادر چچا نے تھوڑے توقف کے بعد پھر کہنا شروع کیا:

''بیٹے ہم جن حالات سے جوجھ رہے ہیں وہ بڑے مایوس کن ہیں، آدھی آدھی رات کو فوجی ہمارے گھروں میں داخل ہوتے ہیں، گھروں کی تلاشی لیتے ہیں اور انھیں دیکھ کر چھوٹے چھوٹے بچے ڈر وخوف سے چیخنے لگتے ہیں اور مرد وعورتیں ڈر کے مارے فوجیوں سے بات کرتے تھتھلا جاتے ہیں تو فوجی ان کی پٹائی کرتے ہیں، اب تو بیٹے ان حالات میں مجھے بہو بیٹیوں کی عصمت بھی خطرے میں دکھائی دیتی ہے، کیا کریں کہاں جائیں۔''

اس قدر پریشان کن حالات میں زندگی گزارنے کے باوجود افسانے کے کردار خاص کر نادر چچا اپنی جنم بھومی سے ہجرت کرنے کی نہیں سوچتے ہیں، بلکہ انھیں یقین ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب حالات سازگار ہوں گے اور زندگی معمول پر آجائے گی، افسانہ نگار نے ایک کردار

(گولو) کی زبانی یہ امید افزا جملہ ادا کرایا ہے:

''ضرور ایک وقت ایسا آئے گا جب باہر کا آدمی اندر نہیں آسکے گا اور اندر کا آدمی اندر والے کو پریشان نہیں کر سکے گا۔''

افسانے میں باہر کے آدمی سے مراد دہشت گرد اور اندر کے آدمی سے مراد ملکی و مقامی فوج کے افسران و افراد ہیں، جن کا برتاؤ کشمیر کے بے قصور لوگوں کے ساتھ بعض اوقات بہیمانہ ہوتا ہے، چنانچہ افسانہ میں ایک جملہ اس تلخ حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ:

''باہر کا آدمی آئے نہ آئے مگر ہمیں تو ہر حال میں فوجیوں کے ہاتھوں پٹنا ہوتا ہے۔''

بایں ہمہ افسانہ نگار نے ایک کردار نادر چچا کی زبانی حب الوطنی اور خصوصاً جنم بھومی سے انتہائی محبت کا اظہار و اثبات کچھ اس طرح کرایا ہے:

''بیٹے میں نے ۱۹۴۷ کا دور بھی دیکھا ہے جب بے شمار لوگ مارے گئے تھے اور ہر شخص اپنی جنم بھومی سے اُکھڑ گیا تھا، لیکن اس عمر میں میرا اپنی جنم بھومی سے اُکھڑ جانا مجھے منظور نہیں، میں اسی مٹی پہ پیدا ہوا ہوں اور اسی میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔''

گویا افسانے کے اس بزرگ کردار (نادر چچا) کی رائے کشمیر کے سوادِ اعظم کی رائے ہے جو کہ سکھ شانتی سے اپنے وطن میں رہنا چاہتا ہے اور یہاں کے ماحول و معاشرت کی اصلاح و بہتری کا خواہاں ہے۔

''مجبوری'' بھی ایک عمدہ افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار کا فن نکھرا ہوا ہے۔ اس میں کردار نگاری کی عمدہ صورت دیکھنے کو ملتی ہے، چنانچہ اسے بڑی ایک کامیاب افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں افسانہ نگار کی سماجی آگہی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی بصیرت فطری طور پر بروئے کار آئی ہے۔ افسانہ نگار نے تمام کرداروں کو ان کی افتادِ طبع اور ذہنی و جذباتی کیفیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لہٰذا افسانہ میں قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ افسانے کی شروعات کچھ اس طرح ہوتی ہے:

''چیلا رام شرما کی موت اڑتیس برس کی عمر میں ایک بس حادثے میں ہوئی تھی۔ موت نے اسے بڑی بے دردی سے اپنی جوان بیوی، ایک بیٹی چندرا اور ایک بیٹے سندرم سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا تھا۔ چیلا رام کی بیوی مندری اپنے جیون ساتھی کی بے وقت موت سے غم میں ادھ موئی سی ہو گئی تھی۔ چندرا کی عمر اس وقت آٹھ برس کی رہی ہوگی اور سندرم دو سال کا۔ مندری کی بیٹی چندرا اپنی ماں سے زیادہ خوبصورت اور ہشیار تھی، چودہ برس کی ہو چکی تھی لیکن قد بت سے اٹھارہ برس کی معلوم ہوتی تھی۔ اس

کی لمبی گھنیری زلفیں، جھیل سی آنکھیں، صراحی دار گردن، ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑیوں ایسے ہونٹ، موتیوں کی طرح چمکتے دانت اور گلنار کی طرح دمکتے رخساروں کو دیکھ کر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چندرا میں غربت کے تھپیڑے سہنے کے باوجود اتنا زیادہ حسن کیوں کر نکھر آیا ہے۔ اسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ حسن اور غربت کی کشمکش میں حسن جیت گیا ہے اور غربت ہار گئی ہے۔ لیکن اس حسن کے خزانے پر ماسٹر سوہن لعل ایک شہ مار بن کر اس وقت آ بیٹھا جب اس کی ڈیوٹی مندری کے گاؤں میں لگی، اس کی بیوی للتا بھی ایک پرائمری اسکول میں استانی تھی۔''

ماسٹر سوہن لعل اور اس کی بیوی للتا (جو کہ بے اولاد ہے) چالاکی سے ''چندرا'' کی شادی پچاس سال کے ایک لاغر اور شرابی آدمی پھول چند (للتا کا بھائی) سے کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس بے میل شادی کی ایک تلخ سچائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے افسانہ نگار نے پھول چند اور اس کی دلہن چندرا کی ''شبِ زفاف'' کا احوال کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''اس رات چندرا کا بدن جوانی کے نشے میں مہک رہا تھا۔ جس رات وہ پیاری سی دلہن کے روپ میں ایک کمرے میں اپنا لباسِ فاخرہ اُتار کر سو گئی تھی اور اس کا بوڑھا پتی پھول چند اُکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ چندرا کو اسے دیکھ کر یوں لگا تھا کہ جیسے اس کے نانا بھول کر اس کے پاس آ رہے ہیں، وہ ڈر و خوف کے مارے کانپ گئی تھی، پھر اس نے گورے بدن پر لڑکھڑاتے ہوئے ہاتھوں کی سرسراہٹ محسوس کی تھی، ایک بوڑھا وجود اس کے مخملی جسم سے لپٹ گیا تھا لیکن لپٹتے ہی وہ آبِ نزول اور ذکاوتِ حس کی وجہ سے ایک طرف لڑھک گیا تھا، اس وقت چندرا نے یوں محسوس کیا تھا کہ جیسے وہ تپتے ہوئے صحرا میں اکیلی العطش العطش پکار رہی ہو۔''

بے میل شادی کی مکروہات کے علاوہ افسانہ نگار نے ایک اور خطرناک واقعہ بیان کیا ہے جو کہ ہمارے سماج کی پیشانی پر بدنما داغ کی صورت میں آج بھی قائم ہے۔ راوی کے مطابق:

''آخر کار چندرا کی پیاس اس رات بجھی تھی جس رات ماسٹر سوہن لعل دبے پاؤں اس کے پاس آ گیا تھا لیکن چندرا کو اپنا ہم عمر نہ ملنے کا احساس اندر ہی اندر نوچ رہا تھا، کیوں کہ ماسٹر سوہن لعل خود بیالیس کا تھا جب کہ چندرا سولہ برس کی تھی۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد چندرا نے ایک بچے کو جنم دیا، بچے کی شکل وصورت بالکل ماسٹر سوہن لعل پر گئی تھی، للتا کو بے انتہا خوشی ہوئی تھی جیسے اس کے بطن سے بچہ پیدا ہوا ہو۔''

''تین سال بعد چندرا نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا، اس کی صورت بھی ماسٹر سوہن لعل پر گئی تھی۔

پھول چند تو بچوں کا برائے نام باپ تھا، بچوں کی ساری ذمہ داریاں ماسٹر سوہن لعل اور للتا نبھا رہے تھے''۔

ظاہر ہے کہ ہمارے سماج میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو غریبوں کا ہر طرح سے استحصال کرتے آئے ہیں، جبر و استحصال کا یہ سلسلہ تاریخ کے ہر دور میں دیکھا جا سکتا ہے۔

افسانہ ''درد بھری راتیں'' میں افسانہ نگار نے جہاں سرکاری شفاخانوں کی بدنظمی، ڈاکٹروں کی مریضوں کے تئیں سرد مہری اور بے توجہی کو اجاگر کیا ہے، وہیں دونسوانی کرداروں کے باہمی مکالمے سے مرد اساس سماج میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے استحصالی رویے کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ظہیرہ بیگم (ایک مریض بچی کی ماں) پاس کے بیڈ نمبر چار والی عورت (دوسرے مریض بچے کی ماں) سے دریافت کرتی ہے:

''بی بی آپ کا گھر والا کہاں ہے؟ یہ بچہ کیوں اتنا روتا ہے؟ اس عورت کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، پھر اس نے اپنی میلی اوڑھنی سے آنسو پونچھے اور بولی:

''بہن! میرا طلاق ہو چکا ہے، میرا شوہر میرے لیے جیتے جی مر گیا ہے، اس نے مجھے محض اس لیے طلاق دیا کہ اسے شراب اور چرس پینے سے منع کرتی تھی۔ میری تین بیٹیاں ہیں اور یہ ایک بیٹا، اس کے پیٹ میں شروع سے درد رہتا ہے اور چند دنوں سے بخار اور کھانسی بھی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ انجکشن اور دوائی سے ٹھیک ہو جائے گا۔''

لیکن یہ بچہ بالآخر فوت ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں راوی نے ایک ساتھ کئی مسائل پر قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ سرکاری اداروں میں پائی جانے والی بدنظمی اور عوام کو فراہم کی جانے والی اشیا اور سہولیات کیکم یابی عام بات ہے، اسی طرح وقت پر دوا نہ ملنے کے سبب بیمار انسانوں کی بے وقت واقع ہونے والی اموات کے دلدوز مناظر بھی ہر جگہ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

''بیٹی'' ایک اصلاحی اندازِ فکر کا افسانہ ہے، اس میں افسانہ نگار نے مرد اساس سماج کی، بیٹی اور عورت کے تئیں روایتی اور فرسودہ سوچ بدلنے پر توجہ مبذول کرائی ہے۔ دو مرد کرداروں کے حوالے سے افسانہ نگار نے ''بیٹی'' کی اہمیت اور ضرورت کا اعتراف کرایا ہے۔ افسانے کے ایک روایتی مرد کردار (باپ) کے یہاں بیٹی کی پیدائش پر جس طرح کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت نظر آتی ہے اسے افسانہ نگار نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''جوں ہی گھر کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کے گھر والے چہرے لٹکائے بیٹھے تھے۔۔۔ لفظ

''بیٹی'' سنتے ہی اس کے دل کی گہرائیوں میں احساسِ ذمہ داری کی تیز چھری اترتی چلی گئی، گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس کے چہرے پر جو بشاشت تھی وہ بہت جلد کافور ہوگئی۔ اُسے یہ معلوم ہوتے ہی بیحد خوف اور دکھ ہوا کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں لوگوں کے سامنے اس کا وجود زمین میں دھنستا جارہا ہو اور لوگ اس کا یہ حال دیکھ کر قہقہے لگا رہے ہوں۔۔۔۔ وہ کمرے سے اٹھ کر برآمدے کی کرسی پر آبیٹھا اور خیالوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا، اسے اپنا مستقبل ایک تاریک دیوار کی مانند دکھائی دینے لگا، بار بار یہ خیال اندر ہی اندر نوچ رہا تھا کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے۔''

بیٹی کی پیدائش سے باپ کے آنکھوں کی نیند اور دل کا سکون غائب ہو چلا ہے، اس پر ذمہ داریوں کا جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو، اسی اضطراری کیفیت میں وہ اپنے دوست مدن ورما کے گھر جاتا ہے (جس کے تین بیٹے ہیں مگر کوئی بیٹی نہیں ہے) مدن ورما دورانِ ملاقات اپنے دوست کو لڑکی کی وقعت اور والدین کے تئیں اس کے ایثار و عقیدت کے متعلق نصیحت آمیز گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

''بیٹی تو خوش نصیبی کی علامت ہے، تیرے گھر لکشمی آئی ہے، میرے دوست بیٹی بہت وفادار ہوتی ہے، جس گھر میں بیٹی نہیں ہوتی وہ گھر کھنڈر ہوتا ہے، بیٹی گھر کی رونق ہوتی ہے، دیکھ میرے تین بیٹے ہیں، میری بیوی گنگوتری کی کمر میں اکثر درد رہتا ہے۔ میں جب دفتر چلا جاتا ہوں اور تینوں بیٹے اسکول چلے جاتے ہیں تو گنگوتری اکیلی درد کی وجہ سے بستر پر کراہتی رہتی ہے، کبھی کبھی ہمارے گھر کھانا بھی نہیں پکتا اور نہ برتن دھوئے جاتے ہیں، میں اور گنگوتری ایک بیٹی کے لیے کتنا ترستے ہیں لیکن ہماری کوئی بیٹی نہیں، میری بیٹی ہوتی تو وہ گھریلو کاموں میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی، لیکن ہم بدنصیبوں کی قسمت میں ''بیٹی'' کہاں۔ اگر تو بیٹی کے پیدا ہونے پر اتنا مایوس ہوا ہے تو لا اپنی بیٹی ہمیں سونپ دے۔ ہم اسے خوشی خوشی اپنالیں گے، ہمارے گھر میں روشنی آجائے گی۔''

اپنے دوست مدن ورما کے ساتھ اس معقول گفتگو سے بیٹی کے تئیں اس کا نظریہ بدل جاتا ہے اور وہ اپنی بیٹی سے سچی محبت کرنے لگتا ہے۔ مدن ورما سے رخصت ہوتے وقت اس کے چہرے پر خوشی کے آثار اور دل میں یقین تھا کہ وہ سچ مچ ایک اہم اور قیمتی شے کا مالک بن گیا ہے۔

''دوہری مار'' افسانے کا پسِ منظر جموں وکشمیر میں کئی برسوں سے پھیلی ہوئی دہشت گردی ہے۔ فیضان اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو اپنی معصومیت کے باوجود ملی ٹینٹوں اور فوجیوں کے قہر کا نشانہ بنتا ہے۔ اس افسانے کے حوالے سے افسانہ نگار نے گزشتہ دو دہائیوں سے وادیِ کشمیر میں پنپنے

والے خوف اور دہشت کے ماحول اور ساتھ ہی ملکی افواج کے غیر ذمہ دارانہ کردار اور جارحانہ طرزِ عمل کا پردہ فاش کیا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نوجوان فیاض کو ایک طرف جہاں انتہا پسندوں کے استحصالی رویّے کا شکار بننا پڑتا ہے، وہیں دوسری طرف فوجیوں اور پولیس (Police) والوں کی سفّاکانہ حرکات وعتاب کا بھی نشانہ بننا پڑتا ہے۔ فیاض کے علاوہ افسانے میں ایک کردار منور کا بھی ہے جو بنیادی طور پر غنڈہ اور بدقماش نوجوان ہے، راوی کے مطابق:

''منور میں ہر طرح کی بُری عادتیں موجود تھیں، اس نے چار سال کے بعد اپنے آپ کو فوج کے حوالے کیا تھا، ان چار برسوں میں اس نے کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا اور کئی ماؤں، بہنوں کی عزت لوٹی تھی، اس کی وجہ سے ''تنظیم'' بالکل بدنام ہوگئی تھی، چنانچہ اس نے فوراً اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دیا تھا، اب فوجی اس سے ایک شکاری کُتّے کی طور پر کام لیتے تھے''۔

غرض کہ افسانہ نگار کے نزدیک وادیِ کشمیر کے عوام بیک وقت انتہا پسندوں اور فوجیوں کے سفاکانہ طرزِ عمل کا شکار ہو رہے ہیں، افسانہ نگار کا تعلق بھی چونکہ وادئ کشمیر سے ہے، اس لیے اس کے مشاہدات بڑی حد تک سچائی پر مبنی ہیں۔

فیاض پر انتہا پسندوں کا جو سلسلۂ جبر واستحصال جاری رہا وہ کچھ اس طرح ہے کہ:

اسلحہ برداروں کا سرپرست فیضان سے کہتا ہے:۔۔۔ ''ہمارے ساتھ چلو یا پھر پچاس ہزار روپیہ دو، ہم تمہاری آزادی کے لیے دن رات لڑ رہے ہیں اور تمہیں بیوی بچے پیارے ہیں!''

بالآخر تیس ہزار روپئے پر معاملہ طے ہوتا ہے اور چار دن بعد دہشت گرد فیضان کے گھر آ کر اس سے تیس ہزار روپئے لے جاتے ہیں۔ یہ ''پہلی مار'' ہے جو وادی کے غریب وخستہ حال عوام کو دہشت گردوں سے جھیلنی پڑتی ہے، ''دوسری مار'' وہ ہے جو بے گناہ لوگوں کو فوجیوں سے جھیلنی پڑتی ہے۔ آخر الذکر سفاکانہ طرزِ عمل کی نشاندہی کرتے ہوئے افسانہ نگار نے ایک دوسرا واقعہ فیضان کی جواں سال خوبصورت کنواری بہن (نخری) اور غنڈے منور کے تعلق سے بیان کیا ہے، منور نخری کو ہوسناک نظروں سے دیکھتا ہے اور اسے اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتا ہے، یہ بات آگے بڑھ کر منور اور فیضان کے مابین شاخسانہ پر منتج ہوتی ہے، افسانہ نگار نے منور کی اس نفسیاتی کیفیت کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''منور کے دماغ میں فیضان کی گالیاں اور دھمکیاں گونج رہی تھیں، انتقام کی آگ اس کے دل میں بھڑک چکی تھی، ایک دن منور فوج کے کمانڈر کے پاس گیا اور اس سے فیضان کی شکایت کی کہ وہ

دہشت گردوں کو اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے اور ان کی مالی معاونت کرتا ہے، یہ سننا تھا کہ کمانڈر اپنے چالیس سپاہیوں کو ساتھ لے کر فیضان کے گھر پہنچ گیا، کچھ سپاہیوں نے مکان کو چاروں طرف سے اپنے مخصوص فوجی پوزیشن میں گھیر لیا اور کچھ اپنے کمانڈر کے ہمراہ فیضان کے گھر میں داخل ہوئے، شکاری کتا ان کے ساتھ تھا، اتوار کا دن تھا فیضان گھر پر تھا، فوجیوں نے اندر داخل ہوتے ہی فیضان کو اپنی حراست میں لے لیا اور تمام گھر کے افراد کو باہر نکال دیا مگر فیضان کے باپ کو اپنے ساتھ اندر لے جا کر ہر شئے کا معائنہ کروایا، جب کمانڈر کو فیضان کے گھر میں کوئی ایسی چیز دستیاب نہ ہوئی جس کا تعلق تخریبی کارروائی سے ہوتا ہے تو اس نے گرجتے ہوئے فیضان سے پوچھا۔

''تم آتنک وادیوں کو شرن دیتے ہو اور ان کی سہایتا کرتے ہو؟''

''صاحب جی! ہم تو ان کے خلاف ہیں، ہمارے گھر میں آج تک کوئی بھی آتنکی نہیں آیا، یہ سراسر ہم پر الزام ہے'' فیضان نے بلا جھجک جواب دیا، کمانڈر نے کہا:

''سب معلوم ہو جائے گا'' پھر اس نے فیضان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا

''اسے گاڑی میں بیٹھا دو۔''

غرض کہ بے قصور فیضان کو مجرم بنا کر گرفتار کر لیا گیا، آگے جو کچھ زیادتیاں اس پر روا رکھی گئیں، اس کے بارے میں راوی کا بیان ہے:

''اسے فوجیوں نے پولیس کے حوالہ کر دیا، پولیس نے اسے دس دن تک اذیت خانے میں بھیج دیا، جہاں اذیت رساں افراد نے اسے اذیت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اس کے ناخن پلاس سے اُکھاڑ دیئے گئے اور بجلی کے شاک دے دے کر اسے ایک طرح سے مفلوج بنا دیا گیا، دس دن کے بعد جب فیضان اپنے گھر لوٹا تو اس کے ماں باپ اور بیوی بچے اسے پہچان نہیں پائے۔''

فیضان کو جس طرح اذیتیں دی گئیں، ان میں سے بعض تکالیف جان لیوا بھی تھیں، اس شرحیا سوز حرکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے افسانہ نگار نے لکھا ہے:

''دو ماہ کے بعد فیضان کے سر میں درد کی ترنگ سی اُبھرنا شروع ہوگئی جو بہ تدریج بڑھتی ہی چلی گئی، ڈاکٹروں نے جب اس سے متعلق اپنے طبی طریقۂ تشخیص کی رپورٹ دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس کے دماغ میں ایک ایسا پھوڑا تیار ہو رہا ہے جس سے اس کی قوتِ گویائی سلب ہو جائے گی اور پھر دھیرے دھیرے اس کے تمام حواسِ خمسہ کام کرنا چھوڑ دیں گے۔''

اس طرح سے ''دوہری مار'' افسانہ دراصل جموں کشمیر کے سیاسی و سماجی ڈھانچے کی ہولناکی اور حشر

سامانی کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے، افسانہ نگار نے اس افسانہ کی معرفت وادیٔ کشمیر کے غریب اور متوسط درجے کے لوگوں پر دہشت گردوں اور فوجیوں کے ذریعے برسوں سے روا رکھی جانے والی جابرانہ وسفاکانہ حرکتوں اور بہیمانہ رویوں کا پردہ فاش کیا ہے۔

''پنجرے میں مورنی'' افسانہ میں افسانہ نگار نے ایک طرف جہاں ہمارے سماج کے لالچی انسانوں (پنڈتوں سمیت) کی نفسیات اُجاگر کی ہے، وہیں روایتی اصولوں سے بندھے ہوئے کچھ خاندانوں میں والدین کی کاہلی کے سبب بہن بیٹیوں کو شادی کے بعد پیش آمدہ مصائب ومسائل کی بھی نشاندہی کی ہے۔ افسانے کے اہم کرداروں میں نریش چند اور پنڈت نہایت حریص قسم کے آدمی ہیں، افسانہ نگار کی روایت کے مطابق:

''نریش چند کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انتہائی درجے کے لالچی تھے، ہر اچھی بری چیز کو حاصل کرنے کی امنگ انھیں چین سے جینے نہ دیتی تھی، ان کی حرص کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت ننانوے کے پھیر میں رہتے تھے۔۔۔ نریش چند اپنے چھوٹے بیٹے دھیان چند کی شادی شہر میں کسی امیر باپ کی بیٹی سے کروانے کے متمنی تھے کہ جہاں سے انھیں ایک تو منھ مانگا جہیز ملے اور دوسرا ان کی اپنی دو جوان بیٹیوں کے رشتوں کی کوئی صورت نکل آئے۔''

اسی طرح ایک اور لالچی کردار پنڈت کا بھی ہے جو پیسوں کے لالچ میں کرپال سنگھ کی بیٹی چنچل اور نریش چند کے بیٹے دھیان چند کی غیر موافق کنڈلیوں کو (پیسوں کے لالچ میں) موافق بتا دیتا ہے، اور دونوں کی نامبارک شادی کو مبارک بتاتے ہوئے جلد ہی ان کی شادی کروا دیتا ہے جو بالآخر غیر موافق ثابت ہوتی ہے۔ نریش چند کا ہم زلف وکیل سنگھ بھی لڑکے اور لڑکی کی شادی کرانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، چنچل ایک خوبصورت اور تعلیم یافتہ (ایم۔اے۔) لڑکی ہے جب کہ دھیان چند نہایت بدصورت اور بونے قد کاٹھی کا عام لڑکا ہے جو فروٹ کا کاروبار کرتا ہے، شادی کی بات پکی کرتے وقت کرپال سنگھ کو نریش کے بیٹے دھیان چند کو نہیں دِکھایا جاتا ہے، وکیل سنگھ بھی اس فریب کاری میں شامل رہتا ہے، چنانچہ اتفاق سے ایک دن بازار میں جب نریش چند نے کرپال سنگھ کو اپنے بیٹے دھیان چند کا تعارف کرایا تو کرپال سنگھ کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی، مگر وہ اپنی بات سے نہیں پلٹ سکے، افسانہ نگار نے اس وقت کرپال سنگھ کی ذہنی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اب انھیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ان کے بے وفا دوست وکیل سنگھ نے ان کی پیٹھ پر چھرا گھونپ دیا ہو، مگر پھر بھی انہوں نے اپنے وچن پر ڈٹے رہنے کا تہیہ کرلیا، ڈیڑھ ماہ بعد چنچل کی شادی دھیان چند

سے ہوگئی۔''

چنچل کے سسرال کا احوال و ماحول افسانہ نگار نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''اُس (چنچل) نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی جو خوبصورت سپنے سجائے تھے، ان کی تعبیر آج ایک بھیانک صورت اختیار کر گئی تھی، وہ ایک ایسے گھر میں پہنچا دی گئی تھی، جس گھر کے افراد میں تہذیب و شائستگی نام کی کوئی بھی چیز موجود نہ تھی، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کا کوئی سلیقہ ان میں نہیں تھا،، روپیے کما کر جمع رکھنا ہی ان کا مقصدِ حیات بن گیا تھا، چنچل جب اپنے پتی دیو دھیان چند کو دیکھتی تو دل مسوس کر رہ جاتی، اسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی اس کے سینے پر گرم گرم سلاخ رکھ گیا ہو، اس کے ساتھ دھوکہ و فریب کرنے والوں کی صورتیں اس کی روح کو تڑپا کے رکھ دیتیں۔''

غرض کہ سسرال میں چنچل کی زندگی بہت سی پریشانیوں اور الجھنوں میں گزرتی ہے، آخر میں وہ اپنے والدین کو خط لکھتی ہے، جس سے اس کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے، چنچل اپنے خط میں والدین کو تحریر کرتی ہے:

''آپ نے ایک بوجھ سمجھ کر اپنے سر سے اُتار دیا ہے مگر میری آہ و زاری سننے والا کوئی نہیں ہے، آپ نے میرا جیون ساتھی منتخب کرنے میں خطا کھائی ہے! آپ کو میرا رشتہ کرانے والوں نے دھوکہ دیا ہے، جب مجھے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ میری زندگی تباہ و برباد کر دی گئی ہے تو میں اس وقت خودکشی پہ آمادہ ہو جاتی ہوں۔۔۔کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے من پسند مرد کے ساتھ بھاگ جاؤں مگر مجھے فوراً آپ اور خاندان کی عزت و وقار کا خیال ایسے قابلِ مذمت فعل سے باز رکھتا ہے، میں یہ خط آپ کو اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آپ جب میری بہنوں کے رشتے کی بات کریں تو سب سے پہلے لڑکے کو دیکھ لیجئے گا، اس کے اخلاق، رہن، سہن، تعلیم، قابلیت، پیشہ، شکل وصورت کے علاوہ گھر، خاندان اور ماحول پر ضرور نظر رکھئے گا۔ پیارے پتا جی! آپ نے پھٹی ہوئی قمیض پر سونے کے بٹن ٹانک دیئے ہیں، اب اس کے علاوہ اور کیا لکھوں، آپ میرا حالِ دل پڑھ کر مایوس نہ ہوں بلکہ عبرت لیں، کم از کم میری چھوٹی بہنوں کے لیے آپ مناسب رشتے جوڑنے میں سنجیدگی برتیں گے، بھگوان سے دعا گو ہوں کہ آپ سبھی سدا سکھی رہیں۔

آپ کی چہیتی مگر بدنصیب بیٹی

چنچل''

اس خط میں ایک شادی شدہ مجبور و پریشان بیٹی نے اپنے جو تجربات اور تاثرات بیان کیے گئے ہیں

،وہ تمام والدین کے لیے تنبیہ کا حکم رکھتے ہیں، افسانہ نگار نے چنچل کے قلم سے یہ تو لکھوا دیا ہے کہ ''کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے من پسند مرد کے ساتھ بھاگ جاؤں'' مگر وہ ایسا نہیں کر پاتی ہے اور گھٹ گھٹ کر سسرال ہی میں زندگی گزارتی ہے، چنانچہ افسانہ نگار نے آخر میں لکھا ہے۔۔۔''اب اسے اپنا آپ اس مورنی کی مانند معلوم ہو رہا تھا جو پنجرے میں رکھی گئی ہو اور وہ اُڑان بھرنے کے لیے پر تولتی ہے مگر سعیِ لا حاصل کے بعد وہ ہر بار پھڑ پھڑا کے رہ جاتی ہے۔''

''میٹھا زہر'' افسانہ عہدِ جدید کے ایک مہلک مرض ''ایڈز'' کے مسئلے کو اُبھارتا ہے، اور آج کی نسل کو اس لاعلاج بیماری کے مراکز اور محرکات سے محترز رہنے کا خاموش پیغام دیتا ہے، اس افسانے کے بنیادی کردار بلبیر، رامیشور، اور سنگیتا (طوائف) ہیں، بلبیر ٹرک ڈرائیور ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں اپنی گاڑی سے مال و اسباب ڈھوتا ہے، رامیشور اس کا بچپن کا دوست ہے، جو کہ اپنی جوانی کے جنسی و نفسیاتی تقاضوں سے دوچار ہے۔ بلبیر (جو کہ طوائفوں کے کوٹھوں سے آشنا ہے) اسے اپنے ساتھ کلکتہ کے سونا گاچھی بازار میں لے جاتا ہے جہاں وہ ایک طوائف سنگیتا کے کوٹھے پر پہنچ جاتا ہے، ملاقات کے دوران رامیشور اور سنگیتا کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح ہے۔ طوائف رامیشور سے دریافت کرتی ہے۔

''کیا پہلی بار اس بازار میں آئے ہو؟ اس لڑکی نے رامیشور سے پوچھا۔

''جی ہاں! پہلی بار آیا ہوں''۔

اور وہ رامیشور سے بولی ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں، یہاں سبھی آتے ہیں'' رامیشور نے لڑکی سے پوچھا:

''تمھارا کیا نام ہے؟'' ''میرا نام سنگیتا ہے''، اس بازار میں کب سے آئی ہو؟ تین سال ہوئے ہیں؟ ''میں آئی نہیں لائی گئی ہوں''۔ تمھاری تعلیم؟ ''مَیں بی۔اے۔ میں فیل ہو چکی ہوں''، ''تم پڑھی لکھی ہونے کے باوجود اتنا بُرا کام کیوں کرتی ہو؟''

''رامیشور بابو! یہ میرے نفس کا مسئلہ ہے، مجھے اب عزت نہیں چاہئے، میری عزت تو ہمیشہ کے لیے اُسی دن خاک میں مل چکی ہے، جب مجبوراً اس بازار میں داخل ہوئی تھی، کوئی بھی لڑکی طوائف بننا نہیں چاہتی، لیکن سماج کے مردہ ضمیر لوگ اُسے طوائف بننے پر مجبور کرتے ہیں۔''

سنگیتا ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی، مگر اسے ایک سیاسی کارکن کے ذریعے طوائف کے کوٹھے پر پہنچا دیا جاتا ہے، اس مذموم حرکت سے سیاستِ وقت کے چال چلن کا پتہ چلتا ہے۔

سنگیتا جب طوائف بن جاتی ہے تو پھر وہاں سے شرافت کی دنیا میں نہیں آنا چاہتی، اسے وہی ماحول

سازگار آجاتا ہے اور وہ تمام اطوار و رسوم اپنا لیتی ہے جو کہ طوائفوں سے مختص ہیں، مثلاً رامیشور جب سنگیتا کے کمرے سے باہر جاتا ہے تو وہ اس کے تمام روپئے ہڑپ لیتی ہے، ''کپڑے پہننے کے بعد جب رامیشور نے جوں ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب بالکل خالی تھی، اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمودار ہو گئے، اور وہ سنگیتا سے ملتجی ہو کر کہنے لگا: ''کچھ انصاف کرو، تم تو میری جیب صاف کر گئی ہو، دو سو روپئے رکھ لو اور باقی مجھے دے دو۔''

''رامیشور بابو! چلئے چلئے سیڑھیاں اُتر جایئے، رات کافی ہو چکی ہے، ہم طوائفوں کے ہاں گاہک کو روپئے واپس دینے کا رواج نہیں ہے، ہم روپیہ بٹورتی ہیں، بانٹتی نہیں ہیں، آپ چلئے مجھے اب آرام کرنا ہے۔''

گھر پہنچنے کے دو ہفتے بعد رامیشور کو میٹھا میٹھا بخار اور دست آنے لگے اور اس کی بغل میں گلٹی اور سوجن سی ہونے لگی۔ یہ امراض تیزی سے بڑھتے گئے، رامیشور کے خون، پیشاب اور تھوک کے ٹیسٹ سے پتہ چلا کہ اسے ایڈز جیسی جان لیوا بیماری لاحق ہے۔ ظاہر ہے کہ رامیشور اور اس کے گھر والوں کے لیے یہ انکشاف نہایت پریشان کن تھا۔ افسانہ نگار نے بظاہر اس افسانے میں ہمیں ایڈز کے محرکات و عوامل سے بچنے کا پیغام نہیں دیا، مگر افسانے کے مجموعی تاثر سے قاری تک مصنف کا پیغام پہنچ جاتا ہے، کہانی کار نے ہمارے عہد کے گمبھیر مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، اس افسانے میں افسانہ نگاری کا فن بھی قائم ہے اور مصنف کا اصلاحی اندازِ فکر بھی بروئے کار آیا ہے۔

''چور'' ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں افسانہ نگار نے غلام نبی اور ہیرالعل کے کرداروں کے ذریعہ ہمارے سماج کے دو قسم کے انسانی گروہوں کی سیرت اور شخصیتوں کی نشاندہی کی ہے، ایک قسم کے لوگ وہ ہیں جو سیدھے سادے، صاف دل اور مکر و فریب سے پاک ہیں، دوسرا طبقہ وہ ہے جو مکار اور فریبی ہے اور کذب و ریا کو اپنا ذریعۂ معاش بنائے ہوئے ہے۔ ہیرالعل کا کردار ایسے ہی گروہ کا ترجمان ہے، جو کہ افسانہ میں غلام نبی کو اپنی لچھے دار باتوں میں الجھائے رکھتا ہے، اور جب ان کی ٹرین نکل جاتی ہے تو رات کو ریلوے اسٹیشن پر ان کے ساتھ رہتا ہے، اور غلام نبی کو نشیلی گیس سونگھا کر بے ہوش کر کے ان کا سامان، بریف کیس اور روپیہ لے کر صبح ہونے سے پہلے ہی بھاگ نکلتا ہے۔

غلام نبی سیدھے انسان ہیں، وہ ہیرالعل کا شناختی کارڈ (نامہ نگار) دیکھ کر اس پر اعتبار کر لیتے ہیں، اور اسے دہلی تک کا اپنا ہمسفر بنانے کو بھی راضی ہو جاتے ہیں، گاڑی چوک جانے کے بعد دونوں ریلوے پلیٹ فارم پر ہی رات گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں، چنانچہ ہیرالعل جو بنیادی طور پر ''چور'' ہے، غلام نبی

کو یہ کہتے ہوئے کہ: ''خان صاحب سو جایئے، کافی رات گزر چکی ہے، صرف تین گھنٹے باقی رہ گئے ہیں، سبھی سو گئے ہیں، ذرا بات کو سمجھا کریں، کوئی پولیس والا آپ کو بیٹھا ہوا دیکھ لے گا تو فضول میں تنگ کرے گا، حالات خراب ہیں اور پھر آپ کی داڑھی ٹوپی اور یہ پٹھانی سوٹ اُسے اور شک میں مبتلا کرے گا۔ غلام نبی ہیرالعل کے سمجھانے پر لیٹ گئے اور چند ہی لمحوں میں انھیں نیند آ گئی۔

ظاہر ہے کہ ٹرین اور بس کے سفر کے دوران ایسے حادثات و معاملات عام طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، افسانہ نگار نے ہیرالعل کے پاس جس شناختی کارڈ کا ذکر کیا ہے وہ دراصل ہمارے سسٹم کے دیوالیہ پن کی نشاندہی کرتا ہے کہ چوروں کے پاس ساہوکاروں اور سماجی ذمہ داری نبھانے والے کارکنوں کے شناختی کارڈ موجود ہوتے ہیں اور وہ ان کے ذریعہ سے عوام کے ساتھ ہر طرح کی زیادتی اور چوری چکاری کا سلوک رَوا رکھتے ہیں۔

افسانہ ''شرافت'' میں افسانہ نگار نے ہمارے سماج کے اچھے اور بُرے دونوں طرح کے کرداروں کے معمولاتِ حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ سچے اور ایماندار لوگوں کو اکثر بدمعاش و بے ایمان لوگوں سے نقصان پہنچتا آیا ہے۔ ان کی آزمائشیں ہوتی آئی ہیں، خیر و شر کے مابین تصادم کا سلسلہ ازل سے چلا آتا ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا مگر فتح ہمیشہ سچائی اور ایمان ہی کی ہوئی ہے۔

''شرافت'' نامی افسانے میں رحمت علی، نعمت علی اور لیاقت علی ایماندار، شریف النفس اور تبلیغِ دین کے حامی کردار ہیں، جب کہ چراغ دین اور ساجدہ بیگم عرف سگی بدقماش اور فاحش کردار ہیں۔ ان کے علاوہ تھانے دار کا کردار بھی ہے، جو رشوت لے کر فریقین کے معاملات کو رفع دفع کرا دیتا ہے، گویا سرکاری کارندے اپنا کام ایمانداری سے نہیں بلکہ رشوت لے کر انجام دیتے ہیں۔ اور عوام کو انصاف پانے کے لیے مجبوراً رشوت دینی پڑتی ہے۔ رشوت خوری اصلاً ہمارے سماج کی لاعلاج بیماری بن چکی ہے۔

اس افسانے میں کہانی کار نے یہ نسوانی نفسیاتی عقدہ کھولنے کی بھی سعی کی ہے کہ ''بے میل شادی'' ہو جانے سے عورت کے بگڑنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، اس نفسیاتی مسئلے کو مصنف نے ''پنجرے میں مورنی'' نامی افسانے میں بھی چنچل کے کردار کے حوالے سے اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے، سگی کے بارے میں کہانی کار کا بیان کچھ اس طرح ہے:

''سگی گاؤں کی ایک فاحشہ عورت تھی، اس کا اصل نام تو ساجدہ بیگم تھا، لیکن اس کے پڑوسیوں کو یہ نام اچھا نہیں لگا تو انہوں نے ساجدہ بیگم کے بدلے اسے سگی کے نام سے پکارنا شروع کر دیا، سگی کی شادی

اس کے ماں باپ نے ایک بونے قد کے آدمی سے کر دی تھی جو نہ دیکھنے میں خوبصورت تھا اور نہ ہی چالاک، بلکہ سگی کا برائے نام شوہر تھا، جب کہ سگی انتہائی درجے کی خوبصورت لڑکی تھی شادی کے تین ماہ بعد ہی گاؤں کے اوباش مرد (جن میں چراغ دین بھی شامل تھا) سگی کے اردگرد منڈلانے لگے تھے، جس طرح بھنورا پھول کے اِردگرد منڈلاتا ہے، دھیرے دھیرے سگی نے اپنے حسن وشباب کی نمائش کے ذریعے پورے گاؤں والوں کی رگوں میں جوش وجنون کا تلاطم پیدا کر دیا تھا، سگی کی شادی ہوئے اب پانچ برس ہو چکے تھے اور ان پانچ برسوں میں وہ کئی گھاٹوں کا پانی پی چکی تھی''۔

افسانہ نگار نے سگی کو ایک فاحشہ عورت کے روپ میں متعارف کیا ہے، جس کے بدمعاش اور بدکردار لوگوں سے تعلقات ہیں اور وہ لوگ کبھی بھی کسی بات پر سماج کے شریف لوگوں پر سگی سے کوئی بھی الزام لگوا سکتے ہیں۔ چنانچہ چراغ دین نے سگی سے رحمت علی، نعمت علی اور لیاقت علی پر عصمت دری کا الزام عائد کروا کر انھیں گرفتار کرا دیا، یہ اور بات ہے کہ تھانیدار نے اُن تینوں بے گناہوں کو تین ہزار روپیے کی رشوت لے کر بری کر دیا۔ 'رشورخوری' آج کے سماج و سیاست میں 'ناسور' کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

''دل و دماغ میں گھومتی کیل'' افسانے میں مصنف نے دلدار صاحب کے کردار کے ذریعہ ایک طرف جہاں اسلامی تعلیمات اور تصوف وفلسفہ کے نقوش روشن کیے ہیں، وہیں انسانی اخلاص و ہمدردی ایسی اقدار کے تحفظ وترویج کی سعی بھی کی ہے، افسانہ کا بنیادی کردار دلدار صاحب ہیں جو اپنے تین بچوں اور ایک بیوی (گل بہار) کے ساتھ اسلامی طور طریق سے خوش حال زندگی گزار رہے ہیں، دلدار صاحب کے ذہن پر اسلامی فلسفۂ حیات کے گہرے اثرات ہیں، چنانچہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت بھی اسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ دلدار صاحب اپنے بچوں کے ذریعہ اٹھائے گئے سوالات مثلاً:

''پاپا ہم دنیا میں کہاں سے آئے ہیں کہاں چلے جائیں گے''

پاپا تقدیر کسے کہتے ہیں؟

پاپا۔۔۔شیطان کیا ہوتا ہے؟

وغیرہ کے جوابات بہت معقولیت کے ساتھ دیتے ہیں، اس سے ان کے بچوں کی ذہنی تربیت ہوتی ہے، جب کہ گل بہار دینی تعلیمات کے ساتھ ساتھ دنیاوی نالج پر زیادہ زور دیتی ہے، لہٰذا گل بہار کے یہ کہنے پر کہ۔۔۔: ''ان بچوں کو کچھ پڑھائیں، لکھائیں، یہ شیطان اور انسان کی باتیں

چھوڑیئے، یوں ہی یہ فضول اپنا وقت ضائع کررہے ہیں، انہیں جنرل نالج کی باتیں سکھائیں تاکہ یہ آگے چل کر کچھ بن سکیں۔''

دلدار صاحب گل بہار کو ان باتوں کا جواب کچھ اس طرح دیتے ہیں:

''گل بہار! تم اپنے بچوں میں جو جنرل نالج منتقل کروانا چاہتی ہو، وہ اسی دنیا تک محدود ہے، کیا ہم اپنے بچوں کو روپیے کمانے کی مشین بنانا چاہتے ہیں، یہ بچے ہیں، ان کا نفسیاتی مطالعہ ان کی بہتر تعلیم و تربیت میں کافی اہمیت رکھتا ہے، میں ان کو دین و دنیا کا نالج دینا چاہتا ہوں، گل بہار! زندگی بڑا ہی حسین سفر ہے، بشرطیکہ انسان کو اسے طے کرنے کا سلیقہ آئے، بے صبری انسان کے غصے کو جنم دیتی ہے، اور حرص و ہوس اسے پریشانی، ذلت و رسوائی اور گناہوں کے دلدل میں دھنسا دیتی ہے، اس لیے ہمیں ان فاسد جذبات سے گریز کرنا ہوگا اور ان بچوں کے ساتھ بہار بن کر رہنا ہوگا۔''

اس طرح کی دانشورانہ گفتگو کے بعد دلدار صاحب ۱۲ر نومبر کو ممبئی میں آل انڈیا ریڈیو کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوجاتے ہیں۔ صبح جب چنبیلی ریلوے اسٹیشن پر ٹرین رکی، ''دلدار صاحب کی نظر پلیٹ فارم پر ایک جگہ پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ گزشتہ شب کو تولد ہوا ایک خوبصورت نوخیز بچہ گدڑیوں میں سویا ہوا ہے اور لوگ اسے دیکھ کر ہنستے ہوئے گزر رہے ہیں، یہاں تک کہ پولیس اہل کار اور ریلوے اسٹیشن کے منتظمین بھی اس گدڑیوں میں لپٹے لعل کو ایک بیکار اور نجس شے سمجھ کر نظر انداز کررہے ہیں، دیکھتے دیکھتے ایک مریل سا کالا کتا فرش کو سونگھتا ہوا اس بچے کے قریب پہنچا تو دلدار صاحب نے فوراً اپنا سامان اُٹھایا اور چلتی ٹرین سے اُتر گئے، انھوں نے کتے کو بھگایا اور بچے کو اپنی گود میں اُٹھالیا۔۔۔ بچے نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں، اسی وقت دلدار صاحب نے واپس گھر جانے کا ٹکٹ خریدا۔''

یعنی دلدار صاحب کانفرنس میں شریک نہ ہوسکے اور راستے ہی سے ایک نومولود لاوارث بچے کو لے کر اپنے گھر لوٹ آئے، اپنے گھر پہنچنے پر دلدار صاحب کی بیوی گل بہار کی نفسیاتی کیفیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے:

''گل بہار کے دل میں اپنے شوہر دلدار صاحب کا سولہ برس کا اعتماد متزلزل ہورہا تھا، اس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں اور غم و غصے کے باعث چہرے کی بشاشت مفقود ہوچکی تھی، اس نے روتے ہوئے کہا: ''آخر آج میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں! میرے مرنے کے بعد ایسا کرتے تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا۔۔۔ آپ نے بچوں کا بھی خیال نہیں کیا، نہ جانے کب سے آپ نے دوسری شادی کررکھی ہے،

کہاں رکھی ہے وہ رکھیل، کہو، اس بچے کی ماں کہاں ہے؟

بالآخر دلدار صاحب کے حقیقتِ حال بیان کرنے پر گل بہار نے اس لاوارث بچے کو اپنا لیا، چنانچہ دلدار صاحب گل بہار سے کہتے ہیں:

''اب تم اس لاوارث بچے کی ماں ہو، اسے اپنا تیسرا بیٹا سمجھو، تاکہ اسے کبھی بھی اپنے لاوارث ہونے کا احساس نہ ہو۔''

اس طرح سے افسانہ نگار نے دلدار صاحب کو ایک آدرش وادی کردار کے روپ میں پیش کیا ہے، گل بہار کے کردار کے ذریعے عورت کی فطری نفسیات ظاہر کی ہے، اور اس کردار کو فطری طور پر اپنے آدرش کی طرف راجع کیا ہے۔ اس افسانے کا حصۂ اول تحیر خیز اور قدرے تفکر آمیز ہے مگر آخر کا حصہ بہت سادہ اور آدرش واد کا ترجمان ہوکر رہ گیا ہے۔ درحقیقت ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کے زیادہ تر کردار یا تو سادہ مزاج، شریف النفس اور آدرش وادی ہوتے ہیں یا بدکردار و کم عیار ہوتے ہیں۔ ''دل و دماغ میں گھومتی ہوئی کیل'' افسانے میں بھی دلدار صاحب کا کردار آج کے دور میں کمیاب ضرور ہے۔

''کوفت'' افسانہ کا مرکزی کردار راجندر یادو ہے جو محکمۂ ماحولیات کا ایک نچلے درجے کا ملازم ہے، وہ اپنے بیمار والد کی صحت کا خیال رکھنے والا ذمہ دار اور حساس فرد ہے، اس کی تنخواہ بہت قلیل ہے مگر پھر بھی وہ اپنے گھر اور والدین کے فرائض کی انجام دہی میں بہت سنجیدہ اور فرض شناس واقع ہوا ہے۔

افسانہ نگار نے اس افسانے میں راجندر یادو کو اپنے گھر اور باہر پیش آنے والے تمام واقعات کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے، راجندر یادو چوں کہ بذاتِ خود نیک دل اور نیک نہاد شخص ہے، اس لیے اپنے آس پاس نظر آنے والے بے حیائی، فضول خرچی اور بداطواری کے ماحول و مظاہر سے بہت دکھی ہوتا ہے اور ان واقعات و سانحات سے متاثر ہوکر اپنے تفکر آمیز خیالات کا اظہار کرتا ہے، مثلاً اپنے گھر کو لوٹتے وقت بس میں بیٹھے بیٹھے راجندر یادو کے ذہن میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

''بس میں بیٹھے راجندر یادو سوچتے سوچتے اس بات پر پہنچا کہ دنیا بھی ایک بس کی مانند ہے، جس میں ہم سبھی سوار ہیں، ان مسافروں کی طرح جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی منزل پر اُتر جاتے ہیں اور ہم اپنی سیٹ دوسروں کے لیے خالی کر دیتے ہیں۔۔۔ آدمی جب انسان تھا تو دنیا میں امن و امان تھا۔ جب سے آدمی نے حیوان کا روپ دھارن کیا ہے تو امن و سکون عنقا ہوکر رہ گئے ہیں، اور اب صرف

ہوس پرست، مال وزر کے پجاری، جھوٹے مِتلک دھاری، جھوٹے مولوی اور جھوٹے کرم دھرم والے پیدا ہو رہے ہیں، خواہشوں کے سوداگر اور ریاکاری کے رسیا، اپنی بازی کھیل رہے ہیں، مجھے تو سبھی خواہشوں کے دلال بس صرف روپیے کے دیوتا پر ناک رگڑتے نظر آ رہے ہیں، اُف! ہری اوم! دیا کرو پربھو، دیا کرو!''

راجندر یادو اپنے بس کے سفر کے دوران زندگی اور سماج کے بہت سے اہم اور گمبھیر مسائل پر غور وفکر کرتا ہے، وہ جس قدر باہر کے مسائل ومعاماتِ حیات سے پریشان نظر آتا ہے، وہیں اپنے گھر میں (بیوی کی خوشنودی کے خیال سے) ٹیلیفون لگوانے کے باعث پیدا ہونے والے ڈسٹربینس سے بھی بہت زیادہ متاثر وملول ہوتا ہے، افسانہ نگار کی روایت کے بہ موجب: ''ٹیلی فون لگے ابھی صرف بیس دن ہوئے تھے، لیکن راجندر یادو کے دوست واحباب اور آس پڑوس والے ہر روز کوئی نہ کوئی اس کے گھر پر آ کر ٹیلیفون کرتا، کبھی کبھی آدھی رات کو اس کے فون کی گھنٹی بج اُٹھتی تو اسے اپنی میٹھی نیند فون کے لیے ترک کرنا پڑتی اور دن کو اس کے دوست واحباب اور آس پڑوس والے اس کے پتا کی خیریت معلوم کرنے کے بہانے آدھے آدھے گھنٹے تک اپنے رشتہ داروں کو فون کرتے، راجندر اندر ہی اندر کڑھتا، جھنجھلاتا اور اور دُکھی ہوتا، لیکن زبان سے کچھ نہ کہتا۔ کیوں کہ اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ نہ تو اپنے دوستوں سے فون چھپا سکتا ہے اور نہ رشتہ داروں سے اور نہ ہی کسی سے ٹیلی فون کے روپیے لے سکتا ہے۔''

مذکورہ پریشانیوں کے علاوہ راجندر یادو کو دو ماہ کے ٹیلیفون بل (چودہ سو روپیے) کی مقررہ وقت پر ادائیگی کا مسئلہ بھی درپیش ہے، جس کا حل نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی، چنانچہ راجندر یادو اپنا فون کٹوانے کا ارادہ کرتا ہے مگر راجندر یادو کی اہلیہ نہیں چاہتی کہ فون کا کینیکشن کٹوایا جائے۔ ''کوفت'' افسانے کا پورا پس منظر دیہات کا ہے، گھر میں ٹیلیفون لگانے کے بعد راجندر یادو کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا اس کا بیان افسانہ نگار نے باریک بینی سے کیا ہے، افسانہ میں راجندر یادو کی بیوی نیناں کے کردار میں عورت کی فطرت اور نفسیات کے نقوش بھی اُبھارے گئے ہیں۔ اس افسانے کے پلاٹ میں قدرے بکھراؤ نظر آتا ہے۔ راجندر یادو بیک وقت گھر اور باہر کے متنوع مسائل سے گھِرا ہوا ہے، چنانچہ کہانی کے واقعات میں تسلسل اور ارتباط کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ قاری کو راجندر یادو کے کردار پر خود افسانہ نگار کے کردار اور اس کی ذہنی وقلبی کیفیات وکشمکش کا گمان گزرنے لگتا ہے۔

''افراتفری میں کھڑا آدمی'' افسانے میں مصنف نے فنی چابک دستی سے پرانی اور نئی پیڑھی کے ذہنی، فکری اور تہذیبی بُعد کی نشاندہی کی ہے، مغربی تہذیب ہندستانی تہذیب کے جن جن محاذات و معاملات پر حاوی ہوئی ہے، مذکورہ افسانے کے مطالعے سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس افسانے میں نظر محمد اور چودھری امانت حسین دو خاص کردار ہیں، ضمنی طور پر ان دونوں دوستوں کی اولاد کا بھی ذکر آتا ہے جو اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، اور اپنے اپنے معمولات و میلانات کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ افسانے کا بنیادی کردار نظر محمد ہی کا ہے جو اپنے بچپن کے دوست امانت حسین سے ذہنی ہم آہنگی رکھتا ہے مگر نظر محمد اور امانت حسین کا طریقِ حیات اور ان کی اولاد کے معمولات میں کافی بعد ہے، نظر محمد نے اپنی اولاد کو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی تھی، چونکہ وہ خود صوم وصلوٰۃ کے پابند اور شرعی احکامات پر کاربند تھے، اس لیے انھوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو بھی صوم وصلوٰۃ کا پابند بنا دیا تھا۔ جب کہ امانت حسین کی اولاد موڈرن کلچر کی پروردہ تھی اور ذہنی سطح پر اس پر مغربی تہذیب کے اثرات غالب تھے، افسانہ نگار نے نظر محمد کے کردار میں اسلامی اقدار اور مشرقی تہذیب کے اثرات دکھانے کی کوشش کی ہے، شادی میں کھانا کھانے کے واقعہ اور جشنِ شادی کے دیگر مظاہر اور رسومات سے نظر محمد کبیدہ خاطر ہوتے ہیں۔ مثلاً: ''جب نظر محمد امانت حسین کے گھر پہنچے تو وہاں کا ماحول دیکھ کر وہ کافی رنجیدہ ہوئے، لوگوں کا ہجوم پورے گھر کو گھیرے ہوا تھا، بینڈ باجے کی دھن پر کئی لوگ ناچ رہے تھے، عورتیں اور جوان لڑکیاں بے پردہ دندناتی پھر رہی تھیں، نظر محمد بڑی مشکل سے اپنے دوست امانت حسین کے پاس پہنچے۔''

اسی طرح کھانا کھانے کے وقت نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ناچ گانے، بے پردگی اور بے حیائی بھی نظر محمد کو ملول کرتی ہے۔۔۔ ''دیر تک یہ نوجوان لڑکے لڑکیاں ناچتے ناچتے پسینے سے شرابور ہوئے، ناچ گانا بند ہوا تو لوگوں کا ہجوم کھانے پر ٹوٹ پڑا، بدنظمی اور بداخلاقی کا مظاہرہ ہو رہا تھا، عورتیں اور مرد سبھی ایک ساتھ کھڑے۔۔۔ دھکے پر دھکا لگ رہا تھا۔۔۔ لوگ کھڑے کھڑے کھانا کھا رہے تھے، باتیں کر رہے تھے، یوں معلوم ہو رہا تھا کہ گویا آج کے ترقی یافتہ انسان نے کھڑے کھڑے کھانا پینا جانوروں سے سیکھ لیا ہے، نظر محمد اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے اور ملامت کر رہے تھے کہ انگریز کم بخت تو ہندستان سے چلا گیا ہے مگر ہندستانیوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔۔۔ وہ ابھی یہی سوچتے ہوئے کھانے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک کوئی چھے فٹ کا لمبا نوجوان ان سے

آ ٹکرایا، اس کے ہاتھ سے چاول اور سالن سے بھری پلیٹ چھوٹ گئی اور پوری کی پوری نظر محمد کی برف جیسی سفید اچکن پر پڑ گئی اور چشم زدن میں ان کا پیرہن رنگینیوں میں بدل گیا۔۔۔انھوں نے آہستہ سے خالی پلیٹ واپس اسی جگہ رکھ دی جہاں سے کھانے کے لیے اُٹھائی تھی اور چپکے سے سڑک پر چلے آئے، اس طرح نظر محمد اپنے دوست امانت حسین کے بیٹے کی شادی سے بھوکے گھر لوٹ آئے۔''

اس طرح سے افسانہ نگار نے عہد جدید میں مسلم معاشرے میں بڑھتے ہوئے مغربی اثرات اور طور طریق کا پردہ فاش کیا ہے اور نظر محمد کے کردار کے ذریعے سے کئی مقامات و مسائل پر بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔اس افسانے میں نظر محمد کے کردار کی صورت میں کسی قدر خود افسانہ نگار کی شخصیت اور تفکیر کے نقوش بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں کی اساس روزمرہ پیش آنے والے واقعات، مسائل اور معاملات پر استوار کی ہے، ان کے افسانوں میں ہمارا عصری معاشرہ اپنی تمام ہماہمی اور گہما گہمی کے ساتھ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔افسانوں کے کردار ہمارے آج کے سماج میں زندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اصلاحی فکر رکھتے ہیں۔چنانچہ ان کے افسانوں میں سماجی اصلاح وافادیت کا رجحان نمایاں طور پر نظر آتا ہے، چنانچہ بعض افسانے خالص کرداری نوعیت کے اور زیادہ تر افسانے سچویشنل (Situational) معلوم ہوتے ہیں، اس میں مصنف کے فکری میلان اور گرد و پیش کے احوال وحقائق کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ ہمارے عہد کے بعض معتبر ناقدین مثلاً پروفیسر وہاب اشرفی، حامدی کاشمیری، علی احمد فاطمی، ارتضیٰ کریم، عتیق اللہ اور پروفیسر ظہور الدین وغیرہم نے ڈاکٹر وانی کے افسانوں کی قدر ومنزلت کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوی موضوعات ومیلانات کی نشاندہی کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے:

''ان (مشتاق احمد وانی) کی انگلیاں معاشرے کی نبض پر ہیں اور ان کی کہانیاں آج کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ بالخصوص اخلاقی قدروں کی شکست وریخت، انسانی رشتوں کا بکھرنا، بزرگوں اور ان کی اولادوں کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ، خودغرضی، لالچ اور کاروباری ذہنیت کا فروغ نیز سماجی سطح پر لڑکیوں کی ناقدری اور ان کے جذبات کے تئیں عزیزوں، رشتہ داروں کی بے حسی۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی سماج کے فاسد مادے کے معالج ہیں اور ان کی کہانیاں ترسیل، تاثیر اور دردمندی کے اعتبار سے توجہ چاہتی ہیں۔'' (میٹھا زہر ص:۸)

☆☆☆

Maqsood Ahmad Tabassum ki Naat Goyi: Natiya Rivayat ke Aayine mein

by Dr. Jawed Ahmad (Varanasi) cell-9935957330

ڈاکٹر جاوید احمد (وارانسی)

مقصود احمد تبسم کی نعت گوئی۔ نعتیہ روایت کے آئینے میں

ہیرلڈ بلوم (Herold Bloom) نے شاعرانہ اثر کے تعلق سے لکھا ہے:

''شاعرانہ اثر ایک طرح کا Anxiety Principle ہے۔ شاعر اپنے پیش رووں کے احساس ے بوجھل رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ان کے کارناموں کے تعلق سے اس کا اپنا کارنامہ کیا ہے۔ کیا اس کے لیے نئی بات کہنے کی جگہ بچ رہی ہے کہ نہیں؟ یا محض اس وجہ سے کہ وہ اس کے پہلے ہو گئے ہیں۔ خود اس کے فن کا سقوط ہو گیا ہے؟ انھوں نے کہاں کہاں غلطی کی۔ کہاں کہاں گم راہ ہوئے۔ کس کس طرف ان کی مساعی مشعل راہ ہیں اور کس کس طرح خطرناک؟ اس کشاکش اور بے چینی میں اکثر شعرا اپنی اصل صلاحیتوں کا خون بھی کر دیتے ہیں۔''

یقیناً ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی موضوع جس کے تقریباً تمام پہلوؤں کو زمانے سے برتا جا رہا ہو وہاں اس قسم کے خطرات زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن سفری اصناف میں نعت گوئی ایسی صنف ہے کہ نہ صرف مسلم بلکہ دوسرے مذاہب کے اردو شعرا نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو شاعری کی ۴۰۰، ۳۰۰ سالہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو رسول مقبول کی محبت اور عشق میں چور محبان نے اپنے اپنے نقطۂ یائے نظریات سے اس صنف میں موضوع کی محدودیت کو بھی امکان کی لامحدود وسعتوں کے آئینے میں برتا ہے۔ مقصود احمد تبسم کی نعت گوئی کا جائزہ لیں تو ان کی رسول پاک ﷺ سے محبت عشق کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے اس سے آگے دیوانگی اور ہیجان کی حدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہی محبت قوت اظہار اور قوت تخیل کی اثاث بن کر ان کی تخلیق میں نمایاں ہے ؎

کیوں نہ پہچانیں غلام ان کو اندھیری شب میں — محور حسن و ضیا ان کی جبین اقدس
ان کی اس خندہ جبینی سے بہاروں کو دوام — خوش مزاجی کی ادا ان کی جبین اقدس
بے مثل ہے شہکار ہیں ابروئے مبارک — تخلیق کا معیار ہیں ابروئے مبارک

اس چہرۂ اقدس پہ وہ محراب کی صورت سجدوں کے طلب گار ہیں ابروئے مبارک
مل جائے گی اک جنبش ابرو سے رہائی محشر میں رہا کار ہیں ابروئے مبارک
دلبر کا نہ دلدادہ ہو کیوں کر دل عشاق دلدار کے دلدار ہیں ابروئے مبارک

جیسا کہ اشعار سے واضح ہے۔ مقصود احمد تبسمؔ کی تخلیق کے بیش تر اجزا نعتیہ شاعری کے قدیم وجدید رویوں کی روشنی میں اپنا محاکمہ کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی یاد کو زبان وفن کی تہہ داریوں کے ساتھ برتنا ان کی خاص صفت ہے۔ مقصود احمد تبسمؔ اچھی طرح واقف ہیں کہ جس فن پارے میں تہہ داری نہ ہو (خواہ داخلی معنوی یا لفظوں کی ظاہری واقعاتی اور اساطیری) وہ محض ایک رمزیہ پیکر یا عمومی یک رخے معنی سے زیادہ وقعت کا حامل نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطالب یہ بھی نہیں ہے کہ کچھ زیادہ پیچیدگی ہی اختیار کی جائے بلکہ اپنے نعتیہ وجود کی خصوصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صنف کے مقصد کو بروئے کار لایا جائے۔ یعنی اپنے نعتیہ اشعار کے ذریعہ ایسے تصوراتی حالات پیدا کرنا جو پڑھنے والے اور سننے والے کے ذہن میں موجود تصوراتی حالات پر اس قدر اثر انداز ہوں کہ ذہن اس کے حصار میں مقید ہو کر رہ جائے۔ ایسے فن کی تخلیق کے لیے بعض اوقات اسلوب کی متخالف اور خارجی تنظیمی منصوبہ بندی بھی ناگزیر ہو جاتی ہے ؎

اگر اعزاز کعبہ ہے الم نشرح صفت سینہ تو آقا کا بھی سینہ ہے الم نشرح صفت سینہ
تجلی حق کی جس سے منعکس ہوتی ہے عالم میں وہی شفاف شیشہ ہے الم نشرح صفت سینہ
ہوا ہے جاگتے میں چاک سینہ بار باران کا مشیت کا کرشمہ ہے الم نشرح صفت سینہ
انس کہتے ہیں سلنے کے نشان ہیں ان کے سینے پر رموز حق کا پردہ ہے الم نشرح صفت سینہ
ادھر مقصود موسیٰ ہے ادھر یہ شان ہے ان کی کہ مانگے بن ہی سینہ ہے الم نشرح صفت سینہ

مقصود احمد تبسمؔ اپنے تخیل کو سنوارنے نکھارنے کے لیے دل کی داخلی دنیا کو کام میں لاتے ہیں۔ تخیل کی کارفرمائی مرتبہ وسعت اور گہرائی میں اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اساطیری حقیقتوں کو اس کی حیثیت کے مطابق برتا جائے اور ذاتی اسلوب کی کوشش میں پہلے سے موجود اسلوب کی اتباع کا اثر محض ایک پرتو کی حیثیت رکھے۔ ورنہ وہ اسی حد تک کامیاب ہے جہاں تک اس کی اپنی واردات کا انسلاک دنیا کی دگر واردات کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ مقصود احمد تبسمؔ کے اشعار سے واضح ہے کہ ان کی شاعرانہ ہمدردی شاعر اور قاری کو مشترک کر دیتی ہے۔ جو شاعری کی اصل روح کا خصوصی امتیاز ہے۔ کولرج نے شاعری بالخصوص نظمیہ شاعری کے مخصوص تفاعل کے حوالے سے بہت عمدہ بات کہی

ہے کہ لہجے کے تاثر کی ظاہری شدت اور خلوص ہی نظم کے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر تاثر تبلیغ یا محض جوش یقین کا ہے تو ضروری ہے کہ جس چیز کی تبلیغ کی جارہی ہے یا جس چیز پر یقین کا اظہار کیا جارہا ہے اس میں سب لوگوں کو یقین ہو۔ یا اگر یقین نہ ہو تو نظم کی حد تک وہ یقین پیدا ہو جائے اور عدم یقین معطل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ نعت گوئی کے حوالے سے تبلیغ یا محض جوش یقین پر بھی اہل اسلام کا تو مکمل اعتقاد ہے۔ جن کو یقین نہ ہونے کا امکان ہے وہ تین طرح کے افراد ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو مسلمان پیدا ہوتے ہیں لیکن بے دین ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو دیگر مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں تیسرے وہ جو کسی بھی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے اور خدا کے عدم وجود پر اعتبار رکھتے ہیں۔ مقصود احمد تبسم کے اشعار ان ذہنیت کے قارئین کو بھی نظم کی حد تک یقین دلانے کی پوری قوت رکھتے ہیں۔

خدا نے اس کی قسم اٹھا کر جہاں میں عظمت نشاں بنایا
زمین مکہ پہ جب سے آئے میرے نبی کے قدوم اقدس
خلیل کے نقش پا کا ثانی جو دیکھا رمال چیخ اٹھا
نقوش ایسے بنا رہے تھے مرے نبی کے قدوم اقدس
کب پہاڑوں میں یہ سکت تھی سہہ سکیں شان نزول
مہبط قرآں بنا تھا قلب انور آپ کا

نیند آ جانے پہ بھی ان کا وضو قائم رہے نیند میں بھی جاگتا قلب انور آپ کا
آب زمزم کی فضیلت اس لیے بھی بڑھ گئی آب زمزم سے دھلا تھا قلب انور آپ کا

مقصود احمد تبسم کے اشعار کی داخلی ارتقا کی منزلیں ان صلاحیت اور قوتوں پر منحصر ہیں جو تخلیقی فن کارانہ بلوغت سے تعبیر پاتے ہیں۔ ان کی نعتیہ شعری کائنات اپنے مختلف میلان کے سبب پابندی اور سلہ بند اور مشروط طرز احساس و اظہار سے حتی الامکاں گریز کرتی ہے۔ نعتیہ شاعری کی انفرادی سچائیاں نظم و ضبط کے عقائد کی روشنی میں دوسرے مذاہب کی ان سچائیوں کو جن میں ان کی سچائیوں کی دلیل ہے جو شاعر کی تخلیقات میں نمایاں ہے، سے اس طرح متحارب نہیں ہوئیں کہ ایک دوسرے کو منسوخ یا مجروح کر دے۔ بلکہ غیر جانب دارانہ اصولوں کے تحت آفاقی مذہبی حقائق کا اعلان کرتی ہے:

ہلاکتوں کے مقابل حیات دیتا رہا جہاں جہاں بھی لگا آپ کا لعاب دہن
مہک اٹھا تھا کنواں کلیوں کے پانی سے تھا کتنا مشک بھرا آپ کا لعاب دہن
چکھا تھا غوث نے چھ بار مرتضیٰ کا لعاب تو سات بار پیا آپ کا لعاب دہن

سرحد کن سے پلٹ آتی ہوں گرامیدیں بھیجو سرکار کی خدمت میں درودوں کے گلاب
آج سر کار کی عظمت سے ہے انکار تمہیں منکرو جاؤ گے کس منھ سے وہاں روز حساب
عشق والے تری گلیوں سے نبھائیں گے وفا عقل الجھے گی کہ اک لاکھ کہاں پر ہے ثواب

مقصود احمد تبسم نے اپنے اشعار میں جو واردات بیان کی ہیں وہ غیر مبہم لیکن معنی خیز مفہوم رکھتی ہیں۔اس کی انتہائی صورت اپنے محبوب کی شخصیت کے اثر میں کھوجانے رنمایاں ہوتی ہے۔ذاتی وجود ایک گم شدہ ہستی کی مانند محسوس ہوتا ہے اور ذہنی تجربے کی روشنی میں بھی اس پر محبوب کی شخصیت ایک مرکزی تاثر کی صورت میں ہمہ وقت اس کے تصورات میں مستحکم مقام پر قیام پذیر رہتی ہے، تخیل کی عارفانہ عقل مندی کی علامت بن کر صفحۂ ہستی کے مختلف گوشوں کو منور کرتا ہے۔ان میں شامل جزباتی کیفیت تک دسترس پیش پا افتادہ یا عامیانہ رویوں کے ذریعہ ممکن نہیں۔اپنی اوائلی شکل میں بھی یہ جزباتی کیفیت نام نہاد اخلاقیات کے مختلف اللون تجربات مین گھل مل جاتے ہیں۔

اے نکیرین میں سرکار کا دیوانہ ہوں
اب بھی کیا مجھ سے ضروری ہیں سوال اور جواب ان کی آمد ہو کر مائل بہ کرم ہو جائیں
آنکھیں بھر آتی ہیں آجاتا ہے محفل پہ شباب باوضو سوچ ہو ہر لفظ ہو باندھے احرام
پھر کہیں جا کے کھلا کرتے ہیں نعتوں کے گلاب مہر پہ کیا تحریر تھی یا پھر خجم تھا کتنا آپ ہی جائیں

ہم تو بس اتنا جانتے ہیں تھی مشک کا مصدر مہر ثبوت
خانۂ کعبہ سنگ سیہ پر ناز کرے مقصود یہیں کیا

جسم مبارک عشق کا کعبہ سنگ مطہر مہر نبوت جبین شوق دکھا دے نقوش پائے رسول
لٹائیں گے مرے سجدے عقیدتوں کے گلاب

یہ سچ ہے کہ شعری صنف یا کسی بھی صنف جس میں شاعر ذات کا اظہار کرتا ہے تو حقیقی طور پر لاکھ سعی کے باوجود وہ باقی دو دنیاؤں (حقیقی اور مجازی) سے غیر متعلق نہیں ہوسکتا۔مقصود احمد تبسم اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہیں۔اس لیے انھوں نے نعتیہ حقیقت حال کو انسانی فلاح کے اقوال کی تصدیق کے طور پر بھی برتا ہے۔جو تمام عظیم الشان دنیا کے افراد کی روحانی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں بے حد معاون ہیں اور مذہبی اعتبار سے سفید و سیاہ کے خلط ملط مفروضہ رجیت پسند تصورات کی نفی بھی کرتے ہیں۔وہ اپنی محبوب شعری شخصیت کی اصیت سے دوسروں کو بھی متعارف کراتے ہیں۔نعتیہ شاعری کی محکم روایت میں یہ عنصر خاصی اہمیت کا حامل ہے کہ اسے پڑھ کر قاری اس محبوب شخصیت

کے مختلف جسمانی اور روحانی پہلوؤں سے واقف تو ہوتا ہے ساتھ ہی اپنی شخصیت کے منفی پہلوؤں پر بھی غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ان معنوں میں مقصود احمد تبسّم کے اشعار قابل لحاظ ہیں۔

چراغ ہجر جلا کر چنے ہیں میں نے یہ پھول بشکل نعت پروئے ہیں چاہتوں کے گلاب
ہمارے پاس ہے برہان سورۂ کوثر خدا نے آپ کو بخشے ہیں جلوؤں کے گلاب
نبی کے قرب میں خالق کی بندگی ہو اگر تو رنگ اور ہی دیں گے عبادتوں کے گلاب
ہجوم یاس کی زد میں ہے آپ کا یہ غلام بندھے جو آس تو کھل جائیں راحتوں کے گلاب
بن جائیں مری کھال سے پاپوش نبی کے رگ رگ ہو مری تسمہ ٔ نعلین محمد
مانگو گے اگر ان کے وسیلے سے ملے گا دیتا ہے خدا صدقۂ نعلین محمد

مقصود احمد تبسّم کے بعض اشعار کا سادہ اسلوب ان معنوں میں سادہ نہیں ہے کہ ان پر سہل ممتنع کا دھوکا ہو۔دراصل یہ گمان اس مفروضے کی نفی کے طور پر ہے کہ فارسیت اور پیچیدہ استعارہ و پیکر سے مزین شاعری غیر فطری ہوتی ہے اور اس کے بر خلاف سادہ اسلوب کی شاعری فطری۔لیکن معاملہ یہ ہے کہ کوئی بھی اسلوب سادہ ہوئے بھی مختلف شعری جہت کا حامل ہو سکتا ہے۔مقصود احمد تبسّم کے اشعار منزل بہ منزل شعری ارتقا کی راہوں کو طے کرتے ہیں۔کلام کے تنوع جس کی اہم صفت یہ ہے کہ اس کی کثرت میں بھی وحدت جلوہ گر رہتی ہے۔ان کی نعتیہ شاعری کے رویے کی تبدیلی جس میں محبوب شخصیت کا احترام شامل ہے ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔تحیر کی کیفیتیں جو صوفیانہ شاعری کا بھی خاص وصف ہیں اور اس میں صوفیانہ کرب، رومانی دروں بینی اور صوفیانہ استفسار بھی شامل ہو جاتا ہے۔نعتیہ شاعری میں ڈھل کر مختلف معنوی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

اگر تیرا جانا ہو غار حرا میں خدا کے حضور اپنے سر کو جھکانا
وہاں بندگی کچھ مزا اور دے گی جہاں میرے آقا نے سجدے کیے ہیں

فقط اس واسطے خالد نے ہر اک معرکہ جیتا انھوں نے ٹوپی میں رکھے مرے سرکار کے گیسو
منی میں بال کٹوا کر دیا جب حکم آقا نے ابوطلحہ نے پھر بانٹے مرے سرکار کے گیسو
عمر سے عالم برزخ میں ملنے پر یہ پوچھوں گا کفن میں کس لیے رکھے مرے سرکار کے گیسو
بدعقیدوں نے اگر کھینچنا چاہی مجھ سے اور بھی پھیل گئی میری وفا کی چادر
اک کفن اور بھی ہے زیر کفن زیب بدن لے کے آئی ہے قضا ان کی رضا کی چادر
پہلے دی آپ کو لولاک لما کی چادر اور پھر اس سے نبی ارض و سما کی چادر

مقصود احمد تبسّم کے یہاں محبوب شخصیت یعنی رسول پاک کی ذات سے کوئی نا امیدی یا نارسائی کا جزبہ نہیں ابھرتا۔یعنی انھیں خود کی محبت پر اس قدر اعتماد ہے کہ ان کے اشعار میں ایک طرح کا اصرار بھی نظر آتا ہے۔ جو شاعر کی اپنی ذات کا حصہ ہے اور اس کے اعتماد کو کہ وہ رسول پاک کے در اقدس سے جو بھی چاہے گا، عطا ہوگا، کو مستحکم کرتا ہے۔اسی لیے وہ ایک معتبر غلام کی طرح اپنے دل کے حوادث، بعض مطاہر اور اس کے اسباب جو کبھی کبھار وسوسہ بھی پیدا کرتے ہیں کہ پتہ نہیں غلام کی عرض بارگاہ رسالت میں قبول ہوگی کہ نہ ہوگی جیسے سوال و جواب کو تصور میں ہر سمت سے رسول اور غلامان رسول کی سیرت اور الفت کے تخلیقی ذکر و فکر سے مسترد کر دیتے ہیں۔

ان کی خوشبو کی ردا میں ہوئی ملبوس ہوا ذی نفس اس لیے لیتے ہیں ہوا کی چادر
وہ حالت سجدہ میں ہیں ابرو پہ ہیں زلفیں کیا قابل دیدار ہیں ابروئے مبارک
دیا نور نبوت کا ہے طاقِ جسم اقدس میں اور اک نوری زجاجہ ہے الم نشرح صفت سینہ
ویسے تو بہاتا ہوں تری یاد میں آنسو انمول تھے جو اشک گرے غار حرا میں

شرف تھا کب سابقہ امم کو تمام روئے زمیں ہو معبد
زمیں کو طاہر بنانے والے مرے نبی کے قدوم اقدس

مفسرین کے سردار ہیں جو عبداللہ انھیں ہوا تھا عطا آپ کا لعاب دہن
سرحد کن سے پلٹ آتی ہوں گر امیدیں بھیجو سرکار کی خدمت میں درودوں کے گلاب

مقصود احمد تبسم کے تخیل کا انسلاک ان اشعار سے مکمل طور پر ہے جو انھیں نظم کی اعلیٰ نعتیہ روایت میں بھی داخل کر دیتے ہیں۔ان کے الفاظ کا حسن محض ذاتی یا اضافی نہیں بلکہ حسن کے تعلق سے بیش تر خارجی شرائط کو بھی پر کرتا ہے۔محبوب خدا کے عشق اور ہیجان کے تعلق سے ان کی سیماب وشی اور بے قراری انھیں اپنے مختلف اسلوب کی ایجاد میں مدد کرتی ہے۔شعری حرکت اور تخیل اضطراب شعر گوئی کی نئی نئی صورتوں کو وضع کرتا ہے اور اساطیری حقیقت منطقی حقیقت کا بھی روپ دھار لیتی ہے۔ان کے الگ الگ اشعار ان کے دل کی کیفیت کو اس قدر نمایاں کر دیتے ہیں کہ وحدت تاثیر کی حد تک وہ نعتیہ شاعری کا حق بہت حد تک ادا کر دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے نقوش اتنے گہرے ضرور ہیں کہ کسی دوسری صنف کے تعلق ان کی شناخت کی دریافت کی ضرورت بہر حال نہیں ہے۔

☆☆☆

Mutannau biradari ko ba ekhtiyar banane aur unke ilmi varsa ke tahaffuz mein technology ka kirdar by Osama Naseem(research scholar) Dr.Taiyaba Nazli (asst. Prof.)dept. of education and training, MANUU(Hyderabad)

اوسامانسیم (ریسرچ اسکالر) **ڈاکٹر طیبہ نازلی** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ تعلیم وتربیت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) cell-8790853302, 6276877298

متنوع برادری کو با اختیار بنانے اور ان کے علمی ورثہ کے تحفظ میں ٹیکنالوجی کا کردار

تلخیص:ABSTRACT تیز رفتار تکنیکی ترقی کے دور میں، مقامی علم کے ثقافتی ورثے کی حفاظت کرنا ناگزیر ہے۔ دانشمندی، رسم ورواج اور ماحولیاتی بصیرت اُس مقامی علم سے بھرپور منوّر ہے جس کی جڑیں صدیوں پرانی روایات میں ہیں۔ ماحولیاتی نظام اور ثقافتی شناخت کی بقا کے لیے یہ ضروری ہیں۔ یہاں اس بات اور اُن مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن میں ٹکنالوجی کو دستاویز کاری، ترسیل اور مقامی علم کے احیاء کے لیے ایک طاقتور ٹول کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، فروزاں حقیقت، اور تعاملی ملٹی میڈیا کی مدد سے متحرک محافظ خانے بنانے میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جو مقامی طور طریقوں، زبانوں اور ماحولیاتی حکمت کی گہرائی اور تنوع کو محفوظ کرسکتے ہوں۔

یہ مضمون تکنیکی حل تیار کرنے میں باہمی تعاون اور شراکتی طریقوں کے ممکنہ پہلوؤں پر بھی غور کرتا ہے جو ان کمیونٹیز کو شامل کرنے کے عمل کو یقینی بناتا ہے جن کے علم کو محفوظ کیا جانا ہے۔ مضمون کا بنیادی مقصد ٹیکنالوجی اور مقامی علم کے تحفظ کے درمیان تعلق پر بحث کرنا ہے۔ یہ مضمون مقامی علم کے تحفظ اور فروغ کے لیے عمل انگیزی میں ٹیکنالوجی کے ذمہ دارانہ اور شمولیتی استعمال کی بھی وکالت کرتا ہے۔ روایتی حکمت اور جدید ٹیکنالوجی کے درمیان علامتی تعلق کو تسلیم کرتے ہوئے، ہم ایک ایسے مستقبل کو فروغ دے سکتے ہیں جہاں مقامی کمیونٹیز کا انمول ورثہ متحرک طور پر زندہ رہے نیز عالمی تنوع اور پائیدار ترقی میں اپنا رول ادا کرے۔

کلیدی الفاظ: مقامی علم، ثقافتی ورثہ، تحفظ اور ٹکنالوجی

Indigenous Knowledge, Cultural Heritage, Preservation and Technology

تعارف: ایک ایسے دور میں جس کی تعریف تیز رفتار تکنیکی ترقی کے طور سے ہوتی ہے، مقامی علم کا تحفظ ایک فوری ضرورت کے طور پر ابھرتا ہے۔ مقامی ثقافتوں کے تانے بانے میں سرایت کر جانے والی حکمت، رسوم و رواج اور ماحولیاتی بصیرت کی یہ دولت نہ صرف صدیوں پرانی روایات کی امین ہوتی ہے بلکہ دنیا بھر میں ماحولیاتی نظام اور ثقافتی شناخت کی بقا کے لیے ایک بنیادی وسیلہ بھی بن جاتی ہے۔ چونکہ عالمگیریت اور جدیدیت کی مسلسل لہر سے مقامی علم کی بنیادوں کے ختم ہوجانے کا خطرہ بڑھ رہا ہے، اسلئے ان انموورثے کی حفاظت کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے۔

مقامی علم مختلف طریقوں، عقائد اور تفہیم کا احاطہ کرتا ہے جو فطرت کے ساتھ ہم آہنگی میں نسل در نسل تیار ہوا ہے۔ روایتی شفایابی کے علاج سے لے کر پیچیدہ ماحولیاتی نظم ونسق تک، مقامی کمیونٹیز نے اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہوکر ایسے نفیس طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کی جڑیں فطرت کے لیے گہرے احترام اور تمام جانداروں کے ساتھ منسلک ہیں۔ علم کا یہ پیچیدہ جال نہ صرف مقامی لوگوں کی فطری لچک اور موافقت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ زمین پر زندگی کو برقرار رکھنے والے پیچیدہ ماحولیاتی توازن کے بارے میں ان کی گہری سمجھ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ تاہم، اپنی بے پناہ قدر کے باوجود، مقامی علم کو جدید دور میں بے شمار خطرات کا سامنا ہے۔ تیزی سے شہر کاری، ماحولیاتی انحطاط، ثقافتی انضمام، اور مغربی نظریات کی تجاوزات مقامی حکمت کے تحفظ کے لیے اہم چیلنجز بن گئے ہیں۔ روایتی زبانوں کا انحطاط، زمین اور وسائل کے حقوق کا نقصان، اور مقامی کمیونٹیز کی پسماندگی ان کے علمی نظام کی کمزوری میں اضافہ کرتا ہے، جس سے ثقافتی تنوع اور ماحولیاتی استحکام دونوں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اس تناظر میں، ٹیکنالوجی مقامی علم کی دستاویزات، ترسیل اور احیاء کے لیے ایک طاقتور ٹول کے طور پر ابھرتی ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، فروزاں حقیقت، اور تعاملی ملٹی میڈیا مقامی طریقوں، زبانوں، اور ماحولیاتی بصیرت کی گہرائی اور تنوع کو حاصل کرنے کے لیے اختراعی راستے پیش کرتے ہیں۔ روایتی علم کو ڈیجیٹائز کر کے اور متحرک محافظ خانے تخلیق کر کے، ٹیکنالوجی مقامی کمیونٹیز کو قابل رسائی اور دلکش فارمیٹس میں اپنے ورثے کو محفوظ رکھنے کے قابل بناتی ہے، اور آئندہ نسلوں تک اس کی منتقلی کو بھی یقینی بنا سکتی ہے۔

مزید برآں، باہمی تعاون اور شراکتی نقطہ نظر، مقامی علم کے تحفظ کے تکنیکی حل کی ترقی میں

اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تکنیکی ترقی کے پورے عمل کے دوران مقامی کمیونٹیز کے ساتھ بامعنی مشغولیت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ان کے علم اور نقطہ نظر کا احترام کیا جائے اور ان کو ان مراحل میں شامل کیا جائے، انکی ملکیت اور بااختیار ہونے کے احساس کو فروغ دیا جائے۔ تکنیکی آلات اور پلیٹ فارمز کی مشترکہ تخلیق کر کے، مقامی لوگ اپنے ثقافتی ورثے کیے دعوے دار ہوسکتے ہیں اور اپنی روایات کے تحفظ میں اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں۔

ان تحفظات کی روشنی میں، اس مضمون کا مقصد ٹیکنالوجی اور مقامی علم کے تحفظ کے درمیان کثیر جہتی تعلق کو تلاش کرنا ہے۔ مقامی دانشمندی کو محفوظ کرنے، منتقل کرنے اور اسے زندہ کرنے کے لیے ٹیکنالوجی کی صلاحیت کا جائزہ لے کر، نیز اخلاقی و تکنیکی طریقوں کی وکالت کرتے ہوئے، یہ مضمون اس اہم کردار کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے جو مقامی لوگوں کے ثقافتی ورثے اور ماحولیاتی حکمت کے تحفظ میں ٹیکنالوجی ادا کر سکتی ہے۔ علمی تحقیق، کیس اسٹڈیز، اور حقیقی دنیا کی مثالوں کی ترکیب کے ذریعے، ہمارا مقصد آنے والی نسلوں کے لیے مقامی علم کو محفوظ رکھنے میں مثبت تبدیلی کے لیے ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کے لیے بصیرت اور سفارشات فراہم کرنا ہے۔

مقامی علم کی تعریف: مقامی علم فطرت کی گہری سمجھ کی نمائندگی کرتا ہے، جسے دنیا بھر کے مقامی لوگوں نے نسل در نسل کاشتکاری کی ہے جو صدیوں پرانی روایات میں جڑی ہوئی ہیں اور بزرگوں سے لے کر نئی نسلوں تک زبانی طور پر منتقل ہوئی، دیسی علوم، حکمت، رسوم و رواج اور طرز عمل کی ایک بھرپور دور کو گھیرے ہوئے ہے جو مقامی کمیونٹیز کے ماحول، ثقافت اور روحانیت کے ساتھ گہرائی سے جڑے ہوئے ہیں۔ مقامی علم کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک فطرت کے ساتھ اس کا قریبی تعلق ہے جسکو مقامی لوگوں نے اپنے گہرے مشاہدے، تجربات، اور مقامی ماحولیاتی نظام کے موافقت پر مبنی جدید ترین ماحولیاتی نظام تیار کیے ہیں۔ روایتی ماحولیاتی علم میں پودوں اور جانوروں کے رویے، موسمی چکروں، نمونوں اور ماحولیاتی باہمی انحصار کی گہری تفہیم شامل ہے۔ یہ علم پائیدار وسائل کے انتظام، حیاتیاتی تنوع کے تحفظ، اور ماحولیاتی تبدیلی کے تناظر میں لچک کے لیے ضروری ہے۔

ماحولیاتی حکمت کے علاوہ، مقامی علم، صحت، شفایابی اور بہبود سے متعلق وسیع پیمانے پر طریقوں پر مشتمل ہے۔ دواؤں کے پودوں کے استعمال، روحانی علاج کے طریقوں، اور صحت کے لیے جامع نقطہ ؟ نظر سے جڑے روایتی ادویاتی نظاموں نے دیسی برادریوں کو ہزاروں سال تک برقرار رکھا ہے۔ یہ شفایابی کی روایات نہ صرف پودوں کی دواؤں کی خصوصیات کے بارے میں گہری

تفہیم کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ جسمانی، جذباتی اور روحانی صحت کے باہمی تعلق کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔

زبان اور کہانی سنانے کا عمل مقامی علم کی ترسیل میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے. مقامی زبانیں ثقافتی علم کے ذخیرے ہیں، جو منفرد عالمی نظارے، کائنات، اور ترجیحات کے طریقوں کو مجسم کرتی ہیں۔ زبانی روایات، افسانوں اور تخلیقی کہانیوں کے ذریعے، مقامی کمیونٹیز آبائی تعلیمات، اخلاقی اقدار، اور ماحولیاتی بصیرت کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرتی رہتی ہیں۔ کہانی سنانا ثقافتی شناخت کو محفوظ رکھنے، سماجی ہم آہنگی کو مضبوط بنانے اور ماحولیات اور کمیونٹی کی زندگی کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ روحانیت اور روایتی اعتقاد کے نظام مقامی علم کے لازمی اجزاء ہیں جو زمین، قدرتی وسائل اور انسانی تعلقات کے تئیں رویوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ دیسی کاسمولوجی اکثر زندگی کی تمام شکلوں کے باہم مربوط ہونے اور فطرت کے تقدس پر زور دیتی ہے۔ رسومات، تقاریب اور روحانی مشقیں سرزمین کی عزت، آباؤ اجداد سے رہنمائی حاصل کرنے اور برادری اور ماحول میں توازن اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لیے انجام دی جاتی ہیں۔

دیسی علم کی فراوانی اور لچک کے باوجود، وہ نوآبادیات، عالمگیریت اور ماحولیاتی انحطاط سمیت مختلف عوامل کی وجہ سے تیزی سے خطرے میں ہیں۔ مغربی نظام تعلیم کے مسلط ہونے، زمین پر قبضے، ثقافتی انضمام، اور روایتی زبانوں کیعدم تحفظ نیمقامی علم کی پسماندگی اور اسکے ضائع ہونے میں اہم کردارادا کیاہے۔ مزید برآں، تیزی سے شہرکاری، صنعت کاری، اور موسمیاتی تبدیلیاں بھی مقامی طرز زندگی اور ماحولیاتی طریقوں کی پائیداری کے لیے مضرت رساں ہیں۔ ان چیلنجوں کے جواب میں، مقامی برادریوں اور مجموعی طور پر کرہ ارض کی بھلائی کے لیے مقامی علم کے تحفظ اور اس کو زندہ کرنے کی اہمیت کا ہر جگہ اعتراف ہورہا ہے۔ مقامی لوگ، اسکالرز، پالیسی ساز، اور کارکن دیسی علمی نظاموں کی پہچان اور توثیق کے ساتھ ساتھ مقامی برادریوں کو اپنے ثقافتی ورثے پر دوبارہ دعویٰ کرنے اور اسے زندہ کرنے کے لیے بااختیار بنانے کی وکالت کررہے ہیں۔

مقامی علم فطرت کی گہری اور جامع تفہیم کی نمائندگی کرتا ہے، جس میں ماحولیاتی حکمت، شفا یابی کے طریقوں، ثقافتی روایات، اور روحانی عقائد شامل ہیں۔ صدیوں پرانی روایات میں جڑیں اور زبانی روایات سے گزرے، مقامی علمی نظام لوگوں اور ان کے ماحول کے درمیان گہرے تعلق کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاہم، نوآبادیات، عالمگیریت، اور ماحولیاتی انحطاط کی وجہ سے یہ علمی نظام تیزی سے خطرے میں ہیں۔ مقامی برادریوں اور کرہ ارض کی فلاح و بہبود کے لیے مقامی علم کی اہمیت کو

پہچاننا اور اس کا احترام کرنا اور اس انمول ورثے کو آئندہ نسلوں تک محفوظ رکھنے، دوبارہ زندہ کرنے اور منتقل کرنے کی کوششوں کی حمایت کرنا ضروری ہے۔

مقامی علم کی دستاویزات اور ترسیل میں ٹیکنالوجی کا کردار:

ٹیکنالوجی مقامی علم کی دستاویزات اور ترسیل میں ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے، جو روایتی حکمت کو حاصل کرنے، محفوظ کرنے اور آنے والی نسلوں کے ساتھ بانٹنے کے لیے جدید ٹولز اور پلیٹ فارم پیش کرتی ہے۔ عالمگیریت، ثقافتی انضمام اور ماحولیاتی تبدیلیوں کے تناظر میں، ٹیکنالوجی مقامی برادریوں کو ان کے ثقافتی ورثے اور ماحولیاتی بصیرت کی حفاظت کرنے کا ذریعہ فراہم کرتی ہے، جس سے تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ان کی مسلسل مطابقت اور لچک کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ جس کے لئے مندرجہ ذیل طریقیا پنائے جاسکتے ہیں۔

ڈیجیٹل پلیٹ فارمز: ٹکنالوجی کے بنیادی طریقوں میں سے ایک ڈیجیٹل پلیٹ فارم ہے جو مقامی معلومات کی دستاویزات اور ترسیل کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ ویب سائٹس، آن لائن ڈیٹابیسز، اور ڈیجیٹل ریپوزٹریز متحرک محافظ خانے کے طور پر کام کرتی ہیں جو مقامی علم کا ذخیرہ بن سکتی ہیں اور یہ مقامی کمیونٹیز، محققین، پالیسی سازوں اور عوام کے لیے قابل رسائی ہیں۔ یہ پلیٹ فارم مقامی لوگوں کو اپنی روایات، زبانوں اور ماحولیاتی طریقوں کو ایک ایسے فارمیٹ میں دستاویز کرنے کے لیے جگہ فراہم کرتے ہیں جو آسانی سے تلاش کرنے، شیئر کرنے کے قابل، اور مختلف سیاق وسباق کے مطابق موافقت پذیر ہیں۔ مثال کے طور پر، ہندوستان میں روایتی علم ڈیجیٹل لائبریری (TKDL) طب، زراعت، اور حیاتیاتی تنوع سے متعلق روایتی علم کے ایک جامع ذخیرہ کے طور پر کام کرتی ہے۔ TKDL کے ذریعے، مقامی کمیونٹیز اپنے دواؤں، پودوں، شفایابی کے طریقوں، اور زرعی تکنیکوں کو دستاویزی شکل دے سکتی ہیں، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ یہ انمول علم نہ صرف یہ کہ محفوظ ہے بلکہ غلط استعمال یا استحصال سے بھی محفوظ ہے۔

حقیقی اور تعاملی ملٹی میڈیا: ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے علاوہ، ٹیکنالوجی اختراعی ٹولز بھی پیش کرتی ہے جیسے کہ آگمنٹ رئیلٹی (AR) جو انٹرایکٹو ملٹی میڈیا کو دستاویزی شکل دینے اور دیسی معلومات کو دلچسپ اور جدید طریقوں سے منتقل کرنے میں کام آتی ہے۔ اے آر ایپلی کیشنز صارفین کو ڈیجیٹل معلومات، تصاویر اور ویڈیوز کو طبعی دنیا پر آزمانے کی اجازت دیتی ہیں جس سے تعاملی تجربات پیدا ہوتے ہیں جو مقامی ثقافتوں اور ماحولیاتی نظام کی تفہیم اور استعمال کو بڑھاتے ہیں۔

مثال کے طور پر آسٹریلیا میں مقامی کہانی سنانے کا پروجیکٹ، مقامی کہانیوں اور ثقافتی ورثے کو زندہ کرنے کے لیے AR ٹیکنالوجی کا استعمال کرتا ہے۔ تعاملی کہانی سنانے کے لیے، تجربات کے ذریعہ صارف روایتی مناظر کو تلاش کر سکتے ہیں، زبانی تاریخیں سن سکتے ہیں، اور دیسی رسم ورواج کے بارے میں بصری طور پر دلکش اور ثقافتی طور پر حساس انداز میں جان سکتے ہیں۔

انٹرایکٹو ملٹی میڈیا پلیٹ فارمز، جیسے کہ موبائل ایپلیکیشنز اور ورچوئل رئیلٹی (VR) کے تجربات، مقامی علم کے ساتھ مشغول ہونے کے لیے اضافی راستے فراہم کرتے ہیں۔ یہ پلیٹ فارمز صارفین کو دنیا میں کہیں سے بھی تعلیمی وسائل، زبان کے سبق اور ثقافتی نمائشوں تک رسائی حاصل کرنے کے قابل بناتے ہیں، جس سے بین الثقافتی تفہیم اور مقامی نقطہ نظر کی تعریف کو فروغ ملتا ہے۔

کمیونٹی پر مبنی دستاویزات: اگرچہ ٹیکنالوجی مقامی علم کو دستاویزی شکل دینے کے لیے طاقتور ٹولز پیش کرتی ہے، لیکن اس عمل میں کمیونٹی پر مبنی طریقوں کی اہمیت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ مقامی کمیونٹیز کو دستاویزی عمل میں فعال طور پر شامل ہونا چاہیے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ ان کے علم، نقطہ ؟ نظر اور ترجیحات کا احترام کیا جائے اور انہیں تکنیکی حل میں شامل کیا جائے۔ شراکتی نقشہ سازی کے اقدامات، مثال کے طور پر، مقامی کمیونٹیز کو GIS ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے اپنے روایتی علاقوں، وسائل اور ثقافتی مقامات کے نقشے بنانے کے لیے بااختیار بنا سکتے ہیں۔ نقشہ سازی کے عمل میں فعال طور پر شامل ہو کر، مقامی لوگ اپنے زمینی حقوق پر زور دے سکتے ہیں، قدرتی وسائل کا پائیدار انتظام کر سکتے ہیں، اور ثقافتی طور پر اہم علاقوں کو تجاوزات یا استحصال سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح، ڈیجیٹل کہانی سنانے کی ورکشاپس اور کمیونٹی سے چلنے والے میڈیا پروجیکٹ مقامی نوجوانوں اور بزرگوں کو ڈیجیٹل میڈیا کے ذریعے اپنی کہانیاں، روایات اور ماحولیاتی علم کا اشتراک کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ اقدامات مقامی آوازوں کو وسعت دیتے ہیں، ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھتے ہیں، اور آنے والی نسلوں کو اپنی جڑوں سے دوبارہ جڑنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

چیلنجز اور غور وفکر: اپنے ممکنہ فوائد کے باوجود، مقامی علم کی دستاویزی اور ترسیل میں ٹیکنالوجی کا استعمال چیلنجوں اور اخلاقی تحفظات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ڈیٹا کی خودمختاری، دانشورانہ ملکیت کے حقوق، اور ثقافتی حساسیت جیسے مسائل کو احتیاط سے نیویگیٹ کیا جانا چاہیے تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ ٹیکنالوجی مقامی کمیونٹیز کے مفادات کو پورا کرتی ہے۔ ڈیٹا کی خودمختاری سے مراد مقامی لوگوں کا اپنے

ثقافتی اور دانشورانہ ملکیت کو کنٹرول کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہے۔ مقامی کمیونٹیز کو تکنیکی دستاویزات کی کوششوں کے ذریعے تیار کردہ ڈیٹا اور ڈیجیٹل وسائل پر ملکیت اور کنٹرول ہونا چاہیے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ ان کے علم کا بیرونی اداروں کے ذریعے استحصال یا غلط استعمال نہ ہو۔

دانشورانہ ملکیت کے حقوق ڈیجیٹل دور میں ایک اور اہم چیز ہے۔ مقامی علم اکثر اجتماعی اور مشترکہ ہوتا ہے جو انفرادی تخلیق کاروں کے بجائے پوری برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا مقامی دانشورانہ ملکیت کے تحفظ اور اشتراک کے طریقہ کار کو مقامی برادریوں کے ساتھ مشاورت کے ساتھ انکے روایتی قوانین اور پروٹوکول کا احترام کرتے ہوئے تیار کیا جانا چاہیے۔ ٹیکنالوجی مقامی علم کی دستاویزکاری اور منتقل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے، ثقافتی ورثے اور ماحولیاتی حکمت کے تحفظ کیلئے طاقتور ٹولز اور پلیٹ فارم پیش کرتی ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، فروزاں حقیقت۔(AR)، اور انٹرایکٹو ملٹی میڈیا مقامی ثقافتوں اور ماحولیاتی نظام کے ساتھ مشغول ہونے کے جدید طریقے فراہم کرتے ہیں، ثقافتی تفہیم اور تعریف کو فروغ دیتے ہیں۔ تاہم، مقامی علم کے تحفظ میں ٹیکنالوجی کے استعمال سے منسلک چیلنجوں اور اخلاقی تحفظات کو پہچاننا ان سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ یہ مقامی کمیونٹیز کے بہترین مفادات کو پورا کرے اور ان کی بااختیاریت اور خودارادیت میں حصہ ڈالے۔

مقامی علم کے تحفظ میں باہمی تعاون پر مبنی اور شراکتی طریقے: مقامی علم کے تحفظ میں، تکنیکی حلوں کی ترقی اور نفاذ میں مقامی برادریوں کی فعال شمولیت کو یقینی بنانے کے لیے باہمی تعاون اور شراکتی طریقے ضروری ہیں۔ مقامی آوازوں، نقطہ نظر اور ترجیحات کو مرکز بنا کر، یہ نقطہ نظر کمیونٹیز کو اپنے ثقافتی ورثے پر ایجنسی کا دوبارہ دعویٰ کرنے اور علم کی دستاویزات، ترسیل اور احیاء کے عمل کو شکل دینے کے لیے بااختیار بناتے ہیں۔ تاریخی طور پر، مقامی علم کے تحفظ کی کوششوں کی قیادت اکثر بیرونی اداروں، جیسے کہ حکومتیں، محققین، یا غیر سرکاری تنظیمیں کرتی رہی ہیں، بغیر دیسی برادریوں کے ساتھ مناسب مشاورت یا مشغولیت کے۔ اوپر سے نیچے کا یہ نقطہ نظر بہت سے اقدامات میں ملکیت، اعتماد اور پائیداری کی کمی کا باعث بنا ہے جس سے مقامی لوگوں کو ان کی تاثیر اور مطابقت کو نقصان پہنچا ہے۔

اس کے برعکس، باہمی تعاون پر مبنی اور شراکتی طریقے منصوبہ بندی اور ڈیزائن سے لے کر عمل درآمد اور تشخیص تک پورے پروجیکٹ سائیکل میں مقامی کمیونٹیز کی بامعنی شمولیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر مقامی لوگوں کو ان کے اپنے علمی نظام، ثقافتوں اور ماحول کے ماہرین کے طور پر

پہچانتے ہیں، اور مقامی علم کے تحفظ اور احیاء میں برابر کے شراکت داروں کے طور پر ان کے تعاون کی قدر کرتے ہیں۔ مقامی کمیونٹیز اور بیرونی اسٹیک ہولڈرز، جیسے کہ محققین، تکنیکی ماہرین، ماہرین تعلیم، اور پالیسی سازوں کے درمیان شراکت داری، باہمی تعاون اور شراکتی طریقوں میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ شراکت داری مختلف اسٹیک ہولڈرز کی تکمیلی مہارت، وسائل، اور نیٹ ورکس سے فائدہ اٹھاتی ہیں تاکہ وہ اختراعی حل تیار کر سکیں جو مقامی کمیونٹیز کی منفرد ضروریات اور ترجیحات کو پورا کرتے ہیں۔ شراکتی نقشہ سازی کے اقدامات باہمی تعاون اور شراکتی نقطہ ؟ نظر کی عملاً ٹھوس مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ منصوبے جغرافیائی انفارمیشن سسٹم (GIS) ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے مقامی کمیونٹیز کو ان کے روایتی علاقوں، وسائل اور ثقافتی مقامات کی نقشہ سازی میں مشغول کرتے ہیں۔ مقامی معلومات کو جغرافیائی اعداد و شمار کے ساتھ جوڑ کر، شراکتی نقشہ سازی کمیونٹیز کو اپنے زمینی حقوق پر زور دینے، قدرتی وسائل کو پائیدار طریقے سے منظم کرنے، اور ثقافتی طور پر اہم علاقوں کو تجاوزات یا استحصال سے بچانے کے قابل بناتی ہے۔

تکنیکی مداخلتوں کے علاوہ، باہمی تعاون اور شراکتی طریقوں میں علم کی ترسیل کے روایتی طریقوں جیسے زبانی روایات، تقریبات اور ثقافتی طریقوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ بزرگ، روایتی علاج کرنے والے، اور علم رکھنے والے ان عملوں میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں، نسلی تربیت اور اپرنٹس شپ کے ذریعے نسلی تعلیمات، اخلاقی اقدار، اور ماحولیاتی بصیرت نوجوان نسلوں تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے ممکنہ فوائد کے باوجود، باہمی تعاون اور شراکتی طریقوں کو عملی طور پر مختلف چیلنجوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ طاقت کا عدم توازن، وسائل کی غیر مساوی تقسیم، اور ثقافتی اختلافات مقامی کمیونٹیز اور بیرونی اسٹیک ہولڈرز کے درمیان موثر تعاون کو روک سکتے ہیں۔ مزید برآں، نوآبادیاتی وراثت، تاریخی صدمات، اور جاری منظم ناانصافیاں اعتماد کو ختم کر سکتی ہیں اور بامعنی مشغولیت میں رکاوٹیں پیدا کر سکتی ہیں۔ مزید برآں، باہمی تعاون کے منصوبوں میں فعال طور پر حصہ لینے کے لیے مقامی کمیونٹیز کی مہارت، اعتماد، اور قائدانہ صلاحیت کو بڑھانے کے لیے صلاحیت سازی کے اقدامات، تربیتی پروگرام، اور کمیونٹی کو بااختیار بنانے کی کوششیں ضروری ہیں۔ مقامی لوگوں کی زیر قیادت اقدامات میں سرمایہ کاری کر کے اور مقامی صلاحیتوں کی ترقی کی حمایت کرتے ہوئے، بیرونی اسٹیک ہولڈرز حقیقی شراکت میں سہولت فراہم کر سکتے ہیں جو کمیونٹیز کو اپنے ثقافتی ورثے کی ملکیت لینے اور اپنے مستقبل کو تشکیل دینے کے لیے بااختیار بناتے ہیں۔

مقامی علم کے تحفظ میں ذمہ دار اور جامع تکنیکی استعمال:

مقامی علم کے تحفظ اور فروغ میں ٹیکنالوجی کا ذمہ دارانہ اور جامع استعمال ضروری ہے۔ چونکہ ٹکنالوجی تیزی سے دیسی دانشمندی کی دستاویز کاری کرنے، منتقل کرنے اور اسے زندہ رکھنے کا ایک ذریعہ بنتی جارہی ہے، اس لیے اسکو یقینی بنانا ضروری ہے کہ یہ کوششیں مقامی برادریوں کے حقوق، اقدار اور ترجیحات کا احترام کرتی ہوں۔ ڈیٹا کی خودمختاری، دانشورانہ ملکیت کے حقوق، اور ثقافتی حساسیت جیسے اخلاقی تحفظات کو ترجیح دے کر، اسٹیک ہولڈرز مقامی علم کے تحفظ میں تکنیکی مداخلتوں کے لیے باہمی تعاون اور مساوی انداز کو فروغ دے سکتے ہیں۔

ڈیٹا کی خودمختاری: ڈیٹا کی خودمختاری سے مراد مقامی لوگوں کے اپنے ثقافتی اور دانشورانہ ملکیت کو کنٹرول کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہے، بشمول تکنیکی دستاویزات کی کوششوں کے ذریعے تیار کردہ ڈیٹا اور ڈیجیٹل وسائل۔ مقامی کمیونٹیز کو اپنی کمیونٹیز سے جمع کیے گئے ڈیٹا پر ملکیت اور کنٹرول ہونا چاہیے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ اسے ان طریقوں سے استعمال کیا جائے جس سے ان کی کمیونٹیز کو فائدہ پہنچے اور ان کی اقدار اور ترجیحات کے مطابق ہوں۔ ڈیٹا کی خودمختاری کو برقرار رکھنے کے لیے، ڈیٹا اکٹھا کرنے، ذخیرہ کرنے اور شیئر کرنے کے لیے واضح پروٹوکول اور معاہدے قائم کرنا ضروری ہے جو مقامی حقوق اور مفادات کا احترام کرتے ہیں۔ ان پروٹوکولز کو باخبر رضامندی، کمیونٹی کی شمولیت، اور ڈیٹا کے استعمال اور انتظام سے متعلق فیصلہ سازی کے عمل میں بامعنی شرکت کو ترجیح دینی چاہیے۔ مزید برآں، ڈیٹا گورننس کا ڈھانچہ قائم کیا جانا چاہیے تاکہ مقامی ڈیٹا کی ہینڈلنگ میں احتساب، شفافیت اور نگرانی کو یقینی بنایا جاسکے۔

دانشورانہ ملکیت کے حقوق: دانشورانہ ملکیت کے حقوق ڈیجیٹل دور میں ایک اور اہم بات ہے، خاص طور پر غلط استعمال یا استحصال سے مقامی علم کے تحفظ سے متعلق۔ مقامی علم اکثر اجتماعی ہوتا ہے، جو انفرادی تخلیق کاروں کے بجائے پوری برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا، مقامی دانشورانہ ملکیت کے تحفظ اور اشتراک کے طریقہ کار کو مقامی برادریوں کے ساتھ مشاورت سے، ان کے روایتی قوانین، پروٹوکول اور ثقافتی اصولوں کا احترام کرتے ہوئے تیار کیا جانا چاہیے۔ مقامی دانشورانہ ملکیت کے تحفظ کا ایک طریقہ روایتی علمی لیبلز، سرٹیفکیشنز، یا لائسنسوں کے استعمال کے ذریعے ہے جو مقامی کمیونٹیز کے علم اور ثقافتی ورثے پر ان کے حقوق کو پہچانتے اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ لیبل خلاف ورزی یا غلط استعمال کے معاملات میں مقامی کمیونٹیز کو قانونی شناخت اور سہارا فراہم کرکے

مقامی علم کے غیر مجاز استعمال یا اختصاص کو روکنے میں مدد کر سکتے ہیں۔

ثقافتی حساسیت: مقامی علم کی دستاویز کاری اور منتقل کرنے کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے وقت ثقافتی حساسیت ضروری ہے۔ تکنیکی حل کو مقامی کمیونٹیز کے ساتھ مل کر، ان کے ثقافتی اصولوں، اقدار اور عالمی نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈیزائن کیا جانا چاہیے۔ اس میں اس بات کو یقینی بنانا شامل ہے کہ ڈیجیٹل پلیٹ فارم قابل رسائی، ثقافتی طور پر متعلقہ، اور مقامی زبانوں، روایات اور روحانی عقائد کا احترام کرتے ہیں۔ ثقافتی حساسیت کو یقینی بنانے کا ایک طریقہ کمیونٹی پر مبنی ڈیزائن کے عمل کے ذریعے ہے جو تکنیکی حل کی ترقی اور جانچ میں مقامی کمیونٹیز کو فعال طور پر شامل کرتے ہیں۔ یہ شراکتی نقطہ نظر کمیونٹیز کو ڈیزائن کے پورے عمل میں رائے، ان پٹ اور رہنمائی فراہم کرنے کی اجازت دیتا ہے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ تکنیکی مداخلتیں ان کی ضروریات اور ترجیحات کو پورا کرتی ہیں۔ مزید یہ کہ ثقافتی پروٹوکول اور رہنما خطوط کو تکنیکی منصوبوں میں ضم کیا جانا چاہیے تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ وہ مقامی ثقافتی طریقوں اور پروٹوکول کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ اس میں ڈیجیٹل پلیٹ فارمز میں روایتی علامتوں، منظر کشی اور کہانی سنانے کی تکنیکوں کو شامل کرنا، نیز مقامی کمیونٹیز کے ساتھ تمام تعاملات میں باہمی احترام اور باہمی تعاون کے اصولوں پر عمل پیرا ہونا شامل ہو سکتا ہے۔

مساوی رسائی اور صلاحیت کی تعمیر:

ٹیکنالوجی تک مساوی رسائی اور صلاحیت سازی کے اقدامات اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہیں کہ مقامی کمیونٹیز علم کے تحفظ میں تکنیکی مداخلتوں میں مکمل طور پر حصہ لے سکیں اور اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ قابل اعتماد انٹرنیٹ کنیکٹیویٹی، ڈیجیٹل انفراسٹرکچر، اور تکنیکی مدد تک رسائی مقامی کمیونٹیز کو ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور ٹولز کے ساتھ مؤثر طریقے سے منسلک کرنے کے قابل بنانے کے لیے اہم ہے۔ رسائی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے، اسٹیک ہولڈرز کو ڈیجیٹل خواندگی کے پروگراموں، تربیتی ورکشاپس، اور کمیونٹی پر مبنی ٹکنالوجی کے مرکزوں میں سرمایہ کاری کو ترجیح دینی چاہیے جو مقامی کمیونٹیز کو مہارت، وسائل اور مدد فراہم کرتے ہیں جو ڈیجیٹل منظر نامے پر تشریف لے جانے کے لیے درکار ہیں۔ صلاحیت سازی کے ان اقدامات کو مقامی کمیونٹیز کی مخصوص ضروریات اور ترجیحات کے مطابق بنایا جانا چاہیے، انہیں اپنے تکنیکی مستقبل کی ملکیت لینے اور علم کے تحفظ کی کوششوں میں فعال طور پر حصہ لینے کے لیے بااختیار بنانا چاہیے۔ آخر میں، ٹیکنالوجی کا ذمہ دارانہ اور جامع استعمال مقامی علم کے اخلاقی اور موثر تحفظ اور فروغ کو یقینی بنانے کے لیے ضروری

ہے۔ ڈیٹا کی خودمختاری، دانشورانہ ملکیت کے حقوق، اور ثقافتی حساسیت کے اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے، اسٹیک ہولڈرز مقامی علم کے تحفظ میں تکنیکی مداخلتوں کے لیے ایک باہمی اور مساوی انداز کو فروغ دے سکتے ہیں۔ مساوی رسائی، صلاحیت کی تعمیر، اور کمیونٹی کی شمولیت کے ذریعے، ٹیکنالوجی مقامی کمیونٹیوں کو ان کے ثقافتی ورثے پر دوبارہ دعویٰ کرنے اور اپنے مستقبل کی تشکیل کے لیے بااختیار بنانے کے لیے ایک طاقتور ٹول کے طور پر کام کر سکتی ہے۔

سفارشات اور مستقبل کی ہدایات: ٹیکنالوجی کے ذریعے مقامی علم کے تحفظ اور فروغ میں مزید مدد کے لیے درج ذیل سفارشات اور مستقبل کی ہدایات کو ترجیح دینا ضروری ہے۔

تعاون کو مضبوط بنائیں: مقامی کمیونٹیز، حکومتوں، محققین، اور ٹیکنالوجی ڈویلپرز کے درمیان گہرے تعاون کو فروغ دیں تاکہ مقامی لوگوں کی منفرد ضروریات اور ترجیحات کو پورا کرنے کے لیے اختراعی حل تخلیق کیے جا سکیں۔

مقامی قیادت کو بااختیار بنائیں: صلاحیت سازی کے اقدامات میں سرمایہ کاری کریں جو مقامی برادریوں کو تکنیکی مداخلتوں کی ملکیت لینے کے لیے بااختیار بناتے ہیں، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ ان کے پاس ڈیجیٹل لینڈ سکیپ کو مؤثر طریقے سے نیویگیٹ کرنے کے لیے درکار مہارتیں، وسائل اور مدد حاصل ہو۔

اخلاقی رہنما خطوط کو فروغ دیں: مقامی علم کے تحفظ میں ٹیکنالوجی کے ذمہ دارانہ اور جامع استعمال کے لیے اخلاقی رہنما خطوط اور پروٹوکول تیار کریں اور ان پر عمل درآمد کریں، ڈیٹا کی خودمختاری، دانشورانہ ملکیت کے حقوق، اور ثقافتی حساسیت کے اصولوں کو ترجیح دیں۔

ڈیجیٹل تقسیم کو پُر کریں: ڈیجیٹل انفراسٹرکچر، انٹرنیٹ کنیکٹیویٹی، اور ڈیجیٹل خواندگی کے پروگراموں میں سرمایہ کاری کر کے رسائی اور کنیکٹیویٹی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کریں جو مقامی کمیونٹیز کے تمام اراکین کے لیے ٹیکنالوجی تک مساوی رسائی کو یقینی بناتے ہیں۔

مقامی قیادت والے اقدامات کی حمایت کریں: مقامی لوگوں کی زیر قیادت اقدامات اور منصوبوں کے لیے فنڈنگ اور تعاون کو ترجیح دیں جو ٹیکنالوجی کے ذریعے مقامی علم کے تحفظ، احیاء اور ترسیل کو ترجیح دیتے ہیں۔

ان سفارشات اور مستقبل کی سمتوں کو اپناتے ہوئے، اسٹیک ہولڈرز مقامی لوگوں اور ان کے علمی نظام کی لچک اور ثقافتی خودمختاری کی حمایت میں ٹیکنالوجی کی تبدیلی کی صلاحیت کو بروئے کار

لانے کے لیے مل کر کام کر سکتے ہیں۔

خلاصہ: ثقافتی ورثے اور ماحولیاتی حکمت کے تحفظ کے لیے ٹیکنالوجی کے ذریعے مقامی علم کا تحفظ اور احیاء سب سے اہم ہے۔ باہمی تعاون اور شراکتی طریقوں کے ذریعے، مقامی کمیونٹیز کو اپنے علمی نظام پر ایجنسی کا دوبارہ دعوی کرنے اور دستاویزات، ترسیل اور احیاء کے عمل کو تشکیل دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ تاہم، اس کوشش کی رہنمائی ذمہ داری، شمولیت اور ثقافتی حساسیت کے اصولوں سے ہونی چاہیے تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ تکنیکی مداخلتیں مقامی لوگوں کے حقوق، اقدار اور ترجیحات کا احترام کرتی ہیں۔ جیسا کہ ٹیکنالوجی کا ارتقاء جاری ہے، ڈیٹا کی خودمختاری، دانشورانہ ملکیت کے حقوق، اور مساوی رسائی کو ترجیح دینا بہت ضروری ہے تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ مقامی کمیونٹیز اپنے ثقافتی اور دانشورانہ ملکیت پر کنٹرول برقرار رکھیں۔ واضح پروٹوکول، گورننس کے ڈھانچے، اور صلاحیت سازی کے اقدامات کے قیام سے، اسٹیک ہولڈرز مقامی علم کے تحفظ میں تکنیکی مداخلتوں کے لیے باہمی مفید نقطہ نظر کو فروغ دے سکتے ہیں۔ مزید برآں، ثقافتی حساسیت اور کمیونٹی کی شمولیت تکنیکی حل تیار کرنے کے لیے ضروری ہے جو مقامی برادریوں کی متنوع ضروریات اور خواہشات کے لیے احترام، متعلقہ، اور جوابدہ ہوں۔ مقامی آوازوں، نقطہ ؟ نظر اور ترجیحات کو مرکز بنا کر، ٹیکنالوجی مقامی علم کو بڑھانے، ثقافتی ورثے کے تحفظ، اور نسل در نسل منتقلی کو فروغ دینے کے لیے ایک طاقتور ٹول کے طور پر کام کر سکتی ہے۔

روایتی دانشمندی اور جدید ٹیکنالوجی کے درمیان علامتی تعلق کو اپناتے ہوئے، ہم ایک ایسے مستقبل کی راہ ہموار کر سکتے ہیں جہاں مقامی کمیونٹیز کا انمول ورثہ متحرک طور پر زندہ رہے، عالمی تنوع اور پائیدار ترقی میں اپنا حصہ ڈالے۔ حقیقی شراکت داری، باہمی احترام کو فروغ دے کر، ہم آنے والی نسلوں کے لیے مقامی لوگوں اور ان کے علمی نظام کی لچک کی حمایت کرنے کے لیے ٹیکنالوجی کی تبدیلی کی صلاحیت کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔

Refrences:

Fredriksson, M. (2021). Indias's Traditional Knowledge Digital Liberary and the Politics of Patent Classification. Law & Critique. 34(1), 1-19. doi:

10.1007/s10978-021-09299-7

Johnson, R. (2020). Collaborative Approachses to Idigious Knowledge Preservation. Journal of Indigenous Studies. 5(2), 123-136.

Nadkarni, A. & Rajam, S. (2016). Capitalizing the Benefits Traditional Knowledge Digital Liberary (TKDL) in Favour of Indienous Communities. NUJS Law Review. 183-217.

Smith, A. (2018). Cultural Sensitivity in Technological Intervention: A Case Study of Indigenous Communities. In B. Thompson (Ed.) Proceedings of the International Conference on Indigenous Knowledge Preservation. 45-58.

Traditional Knowledge Digital Liberary Unit (TKDL) https://www.csir.res.in/documents/tkdl

☆☆☆

Kashmir....Ye wadi Mujhse kuch kahti hai by Afshana Ghamgeen Basheer (research Scholar, Dept. Of Urdu, Central University of Kashmir, Gandarbal) cell-7780931110 (Basheer Ghamgeen)
افشانہ غمگیں بشیر (ریسرچ اسکالر، مرکزی جامعہ کشمیر گاندربل)

کشمیر۔۔۔۔ یہ وادی مجھ سے کچھ کہتی ہے

بدن گل، چہرہ گل، رخسار گل، لب گل، دہن ہے گل
سراپا اب تو وہ رشک چمن ہے ڈھیر پھولوں کا

کشمیر دنیا بھر میں خوبصورتی کے لیئے مشہور ہے۔ کشمیر کی اس سرزمین کو بجا طو پر جنت نظیر کہا جاتا ہے۔ معتدل آب و ہوا، برف پوش پہاڑ، بہتے چشمے، رنگین باغات اور پرسکوں جھلیں انسانی روح کو فرحت اور طبعیت کو مسرت عطا کرتی ہیں۔ موسم بہار میں مغرب سے چلنے والی روح افزا ہوائیں دن ڈھلنے تک دل کو شادر کھتی ہیں اور سورج ڈھلنے کے بعد مشرق سے خوشبودار ہوائیں آتی ہیں جو صبح تک سلاتی اور خوشی و مسرت دیتی رہتی ہیں۔ پرانوں میں یہ تک کہا گیا ہے کہ کشمیر دیوی دیوتاؤں کی سیر گاہ ہوا کرتا تھا اور یہاں بلبلوں کے نغمیں انسان کے دل سے غم واندوہ مٹا دیتے ہیں۔

دامن سو نہ مرگ سے قائم ہے فطرت کا سہاگ
حسن کی مورت امرناتھ آئینہ ہے شیش ناگ
ہاے چشموں کی روانی ہائے چرواہوں کے راگ
اک مری آنکھوں کی ٹھنڈک اک میرے سینے کی آگ
نقش حیرت ہوں مجھے یار انہیں تقریر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
(تصویر کشمیر از ابوالاثر حفیظ جالندھری)

یہاں کا نشاط باغ اور شالیمار اپنی بے پناہ خوبصورتی کی وجہ سے اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے اور اس پھولوں کی وادی میں ہر باغ کی اپنی انفرادیت اور تاریخ ہے۔ سال 2007 لوگوں کے لیے وقف کیا گیا" گل لالہ باغ" پورے برصغیر میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا باغ شمار ہوتا ہے جہاں ہر

سال لاکھوں کی تعداد میں سیاح آتے ہیں۔ زبرون پہاڑیاں اور شہر آفاق جھیل 'جھیل ڈل' دنیا بھر میں مشہور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کا ذرہ ذرہ خوبصورت ہے اور جس نے اس خط نظیر کو دیکھا وہ اس خوبصورت وادی کی تعریف کیئے بنا کیسے رہ سکتا ہے۔ 'یہ وادی کشمیر ہے جنت کا نظارہ!

وہ لوگ جنہیں اس جنت نظیر کو دیکھنے کا موقع نہ ملا وہ بھی اس حسین وجمیل وادی کے نادیدہ عاشق بن گئے۔ بعض افراد کشمیر کو صنف نازک یا خوبصورت نازنین سے بھی زیادہ حسین پاتے ہیں کیونکہ وہ یہاں کے دریاؤں، وادیوں کو مخمور نسوانی حسن سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی کیفیت ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی تھی، جنہوں نے اپنے دوست اور ہم عصر شیخ محمد عبداللہ سے ایک بار کہا تھا ''بعض اوقات اس حسن کے ادائے دلبری مجھ پر غالب آجاتی ہے اور میں تقریباً بے ہوشی کی سی کیفیت محسوس کرتا ہوں'' (آتش چنار، ص ۳۵۳) انہوں نے ایک بار ماؤنٹ بیٹن سے کہا تھا ''جب مری کوئین اف اسکاٹس سے فرانسیوں نے کیل کی بندرگاہ چھین لی تو مری نے کہا ''مرتے وقت اگر میرے دل کو چیرا جائے تو وہاں ''کیلے'' کا لفظ کھدا ہوا ملے گا اسی طرح میرے دل میں 'کشمیر ' کا لفظ نقش ہے (آتش چنار۔ص ۳۵۳) یہی وجہ ہے کشمیر کی بے مثال خوبصورتی کے پیش نظر ایرانی شاعروں نے اسے اپنے مدفن کے لیے پسند کیا اور کچھ ایسے بھی ہے جنہوں نے اس جنت نظیر وادی سے جدا ہونا کبھی گوارا نہیں کیا اور یہی مستقل سکونت اختیار کی ان میں جہانگری دور کے ملک الشراء مرزا ابو طالب اور دربار شاہی کے ملک الشعراء حاجی محمد خان قدسی قابل ذکر ہیں، جنہیں یہاں کے حسن نے اپنا اسیر بنالیا۔ یہ تو کیفیت ہے ان شعراء کی، جو دور سے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ تو ذرا سوچئے ان اہل وادی، ان شعراء، ان عاشقان فطرت کے جذبات کا عالم کیا ہوگا، جو اسی گل پوش سرزمین میں پیدا ہوئے، یہی پروان چڑھے! بقول محمد الدین فوق:

کچھ زرد زرد چہرے، کچھ سرد سرد آہیں غم افریں مناظر، یہاں بے شمار دیکھیے
دامن قرار دل کے سب تار تار دیکھے جب تیری وادیوں کے کچھ ابشار دیکھے

مگر کیا کیجئے کہ اس خوبصورت جنت نظیر وادی میں آج بے روزگاری عروج پر ہے۔ اگرچہ نوجوانوں کو روزگار دینے کی سعی کی جارہی ہیں مگر ابھی تک ناتسلی بخش، غربت اور تنگدستی کی وجہ سے لوگوں کے چہرے افسردہ اور دل مایوس نظر آتے ہیں۔ سیاحت جو کشمیر کی معیشت کا اہم ستون ہے، وہ بھی بعض اوقات حالات کی وجہ سے متاثر ہوتی ہے۔ جہاں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں سیاح وادی گل پوش کا رخ کرتے ہیں وہیں متعدد جگہوں پر کوڑا کرکٹ کے ڈھیر سے سیلانیوں کے دل

افسردہ بھی ہو ہو جاتے ہیں۔شہر آفاق 'جھیل ڈل' سکڑ کر رہ گئی ہے۔نئی ٹیکنالوجی سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن نئی ٹیکنالوجی کے ساتھ کہی ہم اس خوبصورت وادی کا دل فریب حسن تو نہیں چھین لیتے ہیں ؟کشمیر میں آنے والے مہاجر پرندوں کی تعداد کم ہو چکی ہے!بجلی ٹاورس نصب کرنے سے چڑیا ں، مینا، کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔صحت افزا مقاموں پر ٹورسٹ ہٹس اور عمارتیں تعمیر تو کی جا رہی ہیں مگر یہ تعمیرات کہیں اس خطے کی خوبصورتی ،مخمور دلفریب حسن کو کم تو نہیں کرتے !اگر ہم ان پہلوؤں پر سنجیدگی سے توجہ دیں تو بلاشبہ میرے وطن کے حسن پر اور چار چاند لگ سکتے ہیں۔اگر نہیں ،تو پھر بقول شاعر یہی کہنا پڑے گا۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

☆☆☆

Shakilurrahman ki Adabi Khidmaat by Mohd.Farooq Alam (research Scholar,dept. of Urdu BHU, Varanasi)cell-82524122331
محمد فاروق عالم (ریسرچ اسکالر، شعبہء اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

شکیل الرحمن کی ادبی خدمات

موجودہ ادبی منظرنامے میں شکیل الرحمن کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے۔ جمالیاتی تنقید نگاری میں وہ ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ تنقید کے علاوہ انہوں نے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی، لیکن بحیثیت جمالیاتی تنقید نگار ان کی حیثیت مسلم ہے۔ جمالیاتی تنقید کے حوالے سے انہوں نے درجن بھر سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے بہت سے افسانے، ڈرامے اور ناول تخلیق کئے، لیکن ان اصناف سے ان کو زیادہ شغف نہیں رہا، کیوں کہ ان کی زیادہ تر توجہ جمالیاتی تنقید کی طرف تھی، اس لئے دوسری اصناف میں وہ کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکے جیسا کہ انہوں نے جمالیاتی تنقید کے حوالے سے دیا۔ شکیل الرحمن بہار کے ضلع مشرقی چمپارن کے موتیہاری میں ۱۸ فروری ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد جان تھا۔ یہ اپنے والدین کی چودہ اولادوں میں چھٹویں نمبر پر تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ گھر کی تعلیم کے بعد ان کا داخلہ گاؤں کے مکتب میں کرایا گیا، جہاں مولوی منظور حسین درس وتدریس کا کام انجام دیتے تھے۔ مکتب کی تعلیم کے بعد ۳۹۔۱۹۳۸ء میں ایک مقامی اسکول ''ہیوک اکیڈمی'' میں داخلہ کرایا گیا۔ یہاں پہ وہ ابتدا سے میٹرک تک اپنے کلاس میں نمایاں رہے، ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ محنت کرنے کا بھی جذبہ رکھتے تھے، کچھ ہی سالوں کے اندر اساتذہ کی نظروں میں ہونہار شاگرد کا مقام حاصل کرلیا۔

درس گاہ کے علاوہ دیگر امور میں جیسے موسیقی، فنون لطیفہ وغیرہ میں بھی دلچسپی تھی۔ ان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ انٹر اور بی۔ اے اپنے شہر کے مشہور ومعروف کالج ''منشی سنگھ'' سے فرسٹ پوزیشن کے ساتھ مکمل کیا۔ بی۔ اے۔ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہار کی دارالحکومت پٹنہ کی طرف رخ کیا اور ۱۹۵۱ء میں ایم۔ اے اردو میں داخلہ لیا۔ ایم۔ اے کے بعد ۱۹۶۱ء میں ''پریم چند کی افسانہ نگاری'' کے تحت تحقیقی مقالے پر شکیل الرحمن کو (ڈی

لٹ) ڈاکٹر آف لٹریچر کی سند پٹنہ یونیورسٹی سے تفویض ہوئی۔انھوں نے علامہ جمیل مظہری کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔عہد حاضر میں شکیل الرحمن کا شمار اردو ادب کے معتبر نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تنقیدی و تحقیقی خدمات سے پوری اردو دنیا متاثر ہوئی ہے۔وہ اردو ادب کے ایسے نامور ادیب تھے کہ جنھوں نے اپنے علمی و ادبی سفر میں بہت سی گراں قدر تصانیف چھوڑی ہیں،جن پر ہند و پاک کے بڑے اداروں نے اعزازات و انعامات دیئے۔وہ کئی جامعات کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس منصب سے ان کی انتظامی امور کی صلاحیتوں کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شکیل الرحمن کا علمی و ادبی سفر پانچ دہائی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔وہ کئی خوبیوں کے مالک تھے جس صنف میں قدم رکھا اس میں امتیازی شان پیدا کی۔وہ بلند پایہ شاعر اور فکشن نگار بھی تھے،ان کی غزلیں و نظمیں ان کی شعری ذوق کا مظہر ہیں۔بحیثیت شاعر انہیں خوب شہرت حاصل ہوئی اور ان کے شعری کمالات کا اعتراف علمی و ادبی حلقوں میں کھل کر کیا گیا۔اسی طرح ان کی فکشن نگاری بھی اردو ادب میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔نثر اور شعر دونوں میں ایسی یکساں مہارت کی مثالیں معاصر ادب میں خال خال نظر آتی ہیں۔ان کے تخلیقی سفر کے حوالے سے شعیب شمس اپنی کتاب ''شکیل الرحمن ایک لیجینڈ'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''شکیل الرحمن نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا تنقید سے کی لیکن شروع میں انہیں شہرت و مقبولیت فسانوں کی بدولت ہوئی تھی۔سالندی کے کنارے، کون گلی گیو شیام، لینڈ سلائڈ وغیرہ افسانے بے حد مقبول ہوئے۔ان کے افسانوں کی زبان بے حد دلنشیں ہے۔انہوں نے تین ناول بھی لکھے لیکن بعد میں وہ صرف تنقید اور تحقیق کے ہو کر رہ گئے۔''

(شکیل الرحمن: ایک لیجینڈ،شعیب شمس،ص ۲۷،عفیف پرنٹس،دہلی ۲۰۰۱ء)

تحقیقی نقطۂ نظر سے ہر ایک گوشہ تحقیق طلب ہے، ان تمام خوبیوں کے باوجود ان کی تنقیدوں نے بھی اردو ادب کو روشنی بخشی ہے،ان کی تصانیف پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میدان میں بھی امتیازی و انفرادی شان رکھتے ہیں۔انہوں نے معاصر اردو تنقید پر ساٹھ گراں قدر کتابیں تصنیف کیں، یہ تمام کتابیں اردو تنقید نگاری کی روایت میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کا شمار اردو کے جمالیاتی نقادوں میں ہوتا ہے،ان کا یہ جوہر ان کی تصانیف کے عناوین سے بھی عیاں ہیں۔شکیل الرحمن نے جمالیاتی تنقید میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ پیش کرنے کے لحاظ سے کوئی کوتاہی نہیں برتی بلکہ پوری ایمان داری کے ساتھ کم و بیش پوری زندگی صرف کر دی۔متعدد

کتابیں جمالیات کے حوالے سے تصنیف کیں۔مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، ہندوستانی جمالیات، منٹو شناسی، نظیر اکبرآبادی کی جمالیات، لوک فنون کی جمالیات، امیر خسرو کی جمالیات، میر تقی میر کی جمالیات، فراق کی جمالیات، اختر الایمان: جمالیاتی لیجینڈ، کبیر، جمالیات حافظ شیرازی، بارہ ماسہ کی جمالیات، ہند اسلامی جمالیات، ہندوستان کا نظام جمال، بدھ نظام جمالیات سے جمالیات غالب تک، محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات، فیض احمد فیض اور ان کی شاعری، راجیو گاندھی : عقیدت کے چند پھول، ایک علامت کا سفر وغیرہ کتابیں جمالیاتی تنقید میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ان میں سے بعض جمالیاتی تنقید کے حوالے سے اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شکیل الرحمن کو ابتدا ہی سے مضمون نگاری میں ذوق وشوق پیدا ہونے لگا تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحقیقی مضامین لکھنے لگے تھے، جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتیرہے۔ذاتی محنت، لگن، جذبہ خود کے ذوق وشوق کی وجہ سے مضامین، آرٹیکل، یہ سلسلہ ملتوی نہ ہو کر تصنیف وتالیف کی شکل اختیار کرتا گیا۔شکیل الرحمن نے ۱۹۵۲ء سے ڈائری لکھنا شروع کیا تھا۔ ڈائری میں اپنے عہد کے خاص تجربات ومشاہدات، خاص واقعہ یا حادثہ جو خود کی ذات سے یا سماج سے متصف ہوگا ذکر کیا ہے۔شکیل الرحمن کی شریک حیات محبوب جہاں بیگم عرف عصمت شکیل ان کی ڈائری کو غور وفکر کے ساتھ مطالعہ کر کے ان کی دلچسپی کا اندازہ کرتی تھیں کہ کس فن میں شکیل الرحمن زیادہ متحرک ہیں۔کن باتوں کی طرف توجہ مرکوز کرتے ہیں، کن ادبا وشعراء سے زیادہ لگاؤ ہے ۔عصمت شکیل اس میں مزید اضافہ کرتی ہیں کیونکہ وہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں جن کا آبائی وطن بنگال ہے۔عصمت شکیل اضافے کے طور پر اپنے یہاں کے تہذیب وثقافت، رسم ورواج اور وہاں کی مشہور ومعروف چیزوں، عمارتوں کو بیان کی ہیں جس کا تاریخ ہند میں ایک اہم مقام ہے۔اس کے علاوہ عصمت نے اپنی زندگی کے تجربات ومشاہدات، پریشانیاں، دقتوں کو بھی ترتیب وار بیان کی ہیں، جن سے وہ دو چار ہوئی تھیں۔عصمت شکیل تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ دیندار خاتون تھیں ہمیشہ بوقت ضرورت شکیل الرحمن کی مدد کی۔شکیل الرحمن بھی اکثر وبیشتر ہر مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے تا کہ رائے جانی جا سکے۔

''۵۵۔۱۹۵۴ء کی بات ہے، ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھا، مارکس اور لینن کے بعض بنیادی تصورات اور خیالات سے وابستہ تھا۔اپنے ملک میں جمہوری اور اشتراکی قدروں کی روشنی بہتر روشنی دیکھنے کی خواہش مند تھا سوویت یونین اور چین کے سماج کی طرح اپنے ملک میں بھی ایک

اشتراکی سماج دیکھنے کی خواہش تھی چاہتا تھا اسی نوعیت کا ایک انقلاب اپنے ملک میں آجائے۔زمینداری، سسٹم ختم ہونے کا اعلان ہو چکا تھا اور دوسرے کئی زمینداروں کے منیموں کی طرح اس کے منیم جی بھی حساب کتاب درست کر رہے تھے۔کاغذات کو جلد داخل کر دینا تھا تا کہ معاوضے کی رقم کا تعین ہو سکے''

(آشرم خودنوشت، شکیل الرحمن، ص۔۲۲۷۔۲۲۸۔عرفی پبلی کیشنز گڑگاؤں ہریانہ۔۲۰۱۱ء)

شکیل الرحمن کی عادات واطوار کا اندازہ ان کی خودنوشت ''آشرم'' کے مطالعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔اپنی خودنوشت ''آشرم'' میں انہوں نے اپنی زندگی کے ان تمام حدثات واقعات کو بیان کر دیا ہے، جن کو وہ سمجھتے تھے کہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہیں۔اپنی خودنوشت میں انہوں نے جمالیات کے حوالے سے بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ان کی جمالیا کو لے کر کیا سوچ تھی، اس کا بھی اظہار اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔اس حوالے سے ان کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا اور نوٹ بک پر مختلف تجربوں کے تعلق سے اپنے تاثرات بھی لکھا کرتا تھا۔ چند صفحات اس طرح لکھے گئے تھے اکثر جب دباؤ محسوس کرتا ہوں تو خاموش ہو جاتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں جب پھر ایسا لگتا ہے جیسے اپنے اندر تیزی سے اتر جاتا ہوں، خاموشی کا وسیع ریگستان۔خاموشی کا پر اسرار سمندر۔پھر کچھ عجیب وغریب تاثرات ابھرنے لگتے ہیں، انوکھے نئے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماضی کی یادیں بادلوں کی مانند سایہ ڈالنے لگتی ہیں اور ان میں سے کچھ یادوں اور تجربوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامنے لگتا ہوں۔اور اچانک ان کی نئی دریافت سے انبساط حاصل کرنے لگتا ہوں، ماضی کی نئی تخلیق اچھی اور بھلی لگتی ہے۔جب اس چپ سے باہر نکلتا ہوں تو دنیا ایک بار پھر ایسی لگتی ہے کہ جس سے گفتگو کی جائے۔میری زندگی کے زیادہ لمحے تو اسی چپ کے اندر گزرے ہیں۔نوٹ بک ۷ رجنوری ۱۹۵۲ء۔''

(آشرم خودنوشت، شکیل الرحمن، ص۔۲۱۰۔عرفی پبلی کیشنز گڑگاؤں ہریانہ۔۲۰۱۱ء)

فکشن کے حوالے سے ان کی متعدد تصنیفات ہیں۔ان میں داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا، فکشن کے فنکار: پریم چند، منٹو شناسی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کتابوں میں انہوں نے فکشن کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی ہے، اور ایک نئے زاویۂ نگاہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ شکیل الرحمن کو تنقید کی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے جن گوشوں

کی طرف اشارہ کیا، ان سے پہلے کسی کی نگاہ اس طرف نہیں کی۔ فکشن کے حوالے سے کئے گئے ان کے کام ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ انہوں نے سفرنامے بھی لکھے۔ ان سفرناموں میں بھی ان کی تنقیدی نظر در آئی ہے۔ وہ ہر چیز کو بڑی باریک بینی سے دیکھتے ہیں۔ ہر چیز کا احتساب کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جو چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں یا کوئی حیرت انگیز چیز دکھتی ہے تو پہلے اس کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں پھر اکا ذکر کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے سفرنامے لکھے، جن میں ''لندن کی آخری رات'' اشاعت ۱۹۸۸ء مطبوعہ اسٹار پبلی کیشنز، دہلی۔ ''قصہ میرے سفر کا'' ۱۹۷۶ء (روس کا سفرنامہ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ''آشرم'' ان کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ ان تمام کتابوں کے علاوہ چند کتابیں متفرق موضوعات پر ہیں جن میں ''راگ راگنیوں کی تصویریں'' ''ابوالکلام'' ''جب جی صاحب'' (مع مقدمہ ومفاہیم) ''در بھنگے کا جو ذکر کیا'' ''محمد اقبال'' ''ہمزاد'' ایک علامت کا سفر'' وغیرہ۔ اردو ادب میں شکیل الرحمن کی جمالیاتی تنقید اور دیگر کتابیں اردو ادب کی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شکیل الرحمن کو ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں مختلف قومی و بین الاقوامی اعزازات وانعامات سے سرفراز کیا گیا جن میں غالب ایوارڈ، اردو اکادمی ایوارڈ، بھارت کا قومی ایوارڈ، ندیم قاسمی ایوارڈ، (پاکستان) شکیل الرحمن کا علمی وادبی سفر نامہ پانچ دہائی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ وہ کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی غزلیں، نظمیں ان کے شعری ذوق کا مظہر ہیں۔ بہ حیثیت شاعر انھیں خوب شہرت حاصل ہوئی اور ان کے شعری کمالات کا اعتراف علمی وادبی حلقوں میں کھل کر کیا گیا۔ اسی طرح فکشن نگاری بھی ادب میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ نثر اور شعر دونوں میں ایسی یکساں مہارت کی مثالیں معاصر ادب میں خال خال نظر آتی ہیں۔

حواشی وحوالے:

۱۔ شکیل الرحمن: ایک لیجینڈ، شعیب شمس، ص ۲۷، عفیف پرنٹس، دہلی ۲۰۰۱ء

۲۔ آشرم خود نوشت، شکیل الرحمن، ص۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ عرفی پبلی کیشنز گڑگاؤں ہریانہ ۔۲۰۱۱ء

۳۔ آشرم خودنوشت، شکیل الرحمن، ص۔ ۲۱۰۔ عرفی پبلی کیشنز گڑگاؤں ہریانہ۔ ۲۰۱۱ء

☆☆☆

Ghazal ko sciency fikr se muzayyan karne wala shair : M.J. Khalid

by engineer Mohd. Adil Faraz (Aligarh) cell-8273672110
انجینئر محمد عادل فرازؔ (علی گڑھ)

غزل کو سائنسی فکر سے مزین کرنے والا شاعر: ایم جے خالد

اردو غزل اپنی روایتی شکل میں جذبات، عشق، اور صوفیانہ رنگ سے مزین رہی ہے، لیکن عصر حاضر میں اس صنف کو جدید سائنسی فکر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے والے شاعروں میں ایم جے خالدؔ کا نام نمایاں ہے۔ موصوف کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ وہ بیک وقت ایک صحافی، سیاح، ماحولیاتی کارکن، اور شاعر کی حیثیت سے منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ ان کی شاعری فلسفیانہ گہرائی، صوفیانہ بصیرت، اور سائنسی شعور کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے شعری مجموعے ''نہادِ نو'' اور ''ستارہ شب سے ہم کلامی'' ان کے وسیع مطالعے، کائناتی مشاہدے، اور ماحولیاتی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایم جے خالدؔ کی شاعری نہ صرف روایتی شاعری کے حسن کو برقرار رکھتی ہے بلکہ کائناتی ارتقا، ماحولیاتی سائنس، نیورو سائنس، اور وجودی سوالات کو بھی شاعرانہ انداز میں پیش کرتی ہے۔ اس مضمون میں راقم القلم نے ایم جے خالدؔ کی غزلوں میں آئے مختلف سائنسی فکر کے عناصر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ کس طرح موصوف عصر حاضر کے سائنسی تناظر میں غزل کو نئے معنی و مفاہیم عطا کر رہے ہیں۔

جب ہم ایم جے خالدؔ کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ موصوف کی زندگی متنوع تجربات سے بھری ہوئی ہے۔ مدراس میں بچپن، دہلی میں تعلیم، اور پہاڑوں، دریاؤں، اور صحراؤں کی سیاحت نے ان کی شاعری کو فطرت اور کائنات سے گہرا منسلک کر دیا ہے۔ چپکو تحریک میں سندر لال بہوگنا کی قیادت میں ان کی شرکت نے ان کے ماحولیاتی شعور کو جلا بخشی، جو ان کی غزلوں میں بھی جھلکتی ہے۔ نصف درجن زبانوں ''اردو، ہندی، انگریزی، جاپانی'' سے آشنائی، فلسفہ، تاریخ، اور ادب کا وسیع مطالعہ، اور الیکٹرانک جرنلزم میں عالمی شناخت نے ان کی شاعری کو ایک عالمگیر زاویہ عطا کیا ہے۔ ان کی غزلیں روایتی ردیف و قافیہ کے ساتھ جدید سائنسی موضوعات کو ہم آہنگ کرتی ہیں، جو انھیں عصر

حاضر کا ایک منفرد شاعر بناتی ہیں۔ایم جے خالدؔ کی غزلوں میں آئے مختلف سائنسی موضوعات کا جائزہ لینے پر یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ ماحولیاتی سائنس ان کی شاعری میں ایک نمایاں موضوع ہے۔وہ قدرتی ماحول کے بدلتے ہوئے نظام اور پیدا ہونے والے نئے ماحولیاتی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔اس فکر سے متعلق شعر ملاحظہ کریں:

بادلو!تم نے جو منہ پھیرا ہے مشکل وقت میں اب تو دریا بھی نہیں دے گا کبھی پانی مجھے

یہ شعر روئے زمین پر پانی کے چکر (hydrological cycle) اور موسمیاتی تبدیلی (climate change) کے اثرات کو شاعرانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔''بادلو'' کو مخاطب کر کے ایم جے خالدؔ نے اپنے اس شعر کے ذریعے دنیا میں پیدا ہونے والے بڑے عالمی مسائل'' گلوبل وارمنگ،گلیشیئر ز کے پگھلنے،موسم کے نظام میں خلل پڑنے'' پر بھی غور وفکر کرنے کے لئے قاری کو آمادہ کیا ہے۔بادل جو پانی کے بخارات سے بنتے ہیں اور بارش کے ذریعے زندگی کو سہارا دیتے ہیں۔جس سے اس زمین پر ایک قدرتی حیاتیاتی نظام قائم ہوتا ہے۔اگر اس نظام میں ذرا بھی کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو نظام حیات کے لئے بہت سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔شعر میں آیا لفظ''منہ پھیرا'' بارش نہ ہونے کے سبب خشک سالی اور پانی کی کمی کے مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔شعر میں''دریا'' کا لفظ زندگی کی علامت ہے،لیکن اس کا''پانی نہ دینا'' ماحولیاتی نظام کی تباہی کو ظاہر کرتا ہے۔ایم جے خالدؔ کی شاعری کی یہ بھی خصوصیات ہے کہ وہ غزل اور سائنسی حقائق کو شاعری کے حسن کے ساتھ جوڑنے کا منفرد ہنر رکھتے ہیں۔لیکن ان کی شاعری کا دائرہ محض ماحولیاتی مسائل کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ وہ فطرت کی تباہی سے پیدا ہونے والی انسانی بے چینی کو بھی بیان کرتا ہے۔ماحولیاتی آلودگی سے متعلق ایک شعر دیکھیں جس کی فکر سے ان کا کرب دوروں بے لگام نظر آتا ہے:

پہنا ہے جو افق نے سیہ چاک پیرہن ہونے لگا ہے کرب دوروں بے لگام پھر

یہ شعر ماحولیاتی آلودگی کے تناظر میں ایک علامتی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔خالدؔ کے مطابق''افق'' یعنی آسمان ایک سیاہ اور پھٹا ہوا لباس پہنے ہوئے ہے۔جو فضائی آلودگی اور آسمان کی خراب حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔کیوں کہ فیکٹریوں،گاڑیوں سے نکلنے والی زہریلی گیسوں،دھوئیں، دھول،اور دیگر آلودگیوں کی وجہ سے آسمان کا رنگ نیلا نہیں رہا ہے، بلکہ اس کی رنگت سیاہ اور دھندلی ہوتی جارہی ہے، جیسے آسمان کوئی پھٹا ہوا میلا کچیلا کپڑا پہنے ہوئے ہے۔شعر میں''کرب دوروں'' سے مراد وہ نقصانات ہیں جو ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے انسانوں، جانوروں،اور فطرت کو پہنچ رہے

ہیں، جیسے کہ صحت کے مسائل، موسم کی تبدیلی، اور قدرتی توازن کا بگڑنا۔ ''بے لگام'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسائل تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ان پر قابو پانا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ فضائی آلودگی کے ساتھ ساتھ ایم جے خالدؔ مٹی کی آلودگی اور کٹاؤ کے مسائل پر بھی فکر مند نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک شعر ملاحظہ کریں:

اے خاک تیرے حصے میں ہے انہدام پھر　　　معدوم ہو کے رہ گئی فصل نموتراش

شعر کے پہلے مصرعے میں ''معدوم'' سے مراد مکمل تباہی یا نیست و نابود ہونا ہے۔ خالدؔ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں فصلیں اور اس کی پیداوار پہلے جیسی نہیں رہی ہیں۔ زمین اپنی زرخیزی کھوتی جا رہی ہے۔ بڑے پیمانے پر کیمائی مادوں کا استعمال، پلاسٹک، صنعتوں سے نکلنے والے زہریلے فضلے مٹّی کی آلودگی کا سبب بنے ہیں۔ جس کی وجہ سے ''خاک کا انہدام'' ہونا یعنی مٹی کی آلودگی اور کٹاؤ کے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ایک علامتی بیان بھی ہے جو فطرت کے استحصال اور اس کے نتائج کو ظاہر کرتا ہے۔

شعر کے دوسرے مصرعے میں خالدؔ ''خاک'' کو مخاطب کر کے قاری کو ایک اہم پیغام بھی دینا چاہتے ہیں کہ یہ ''خاک'' انسانیت کی بنیاد اور زندگی کا سرچشمہ ہے۔ خالدؔ کہتے ہیں کہ اے خاک، تیری قسمت میں ایک بار پھر تباہی لکھ دی گئی ہے۔ لفظ ''پھر'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تباہی کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ ایک بار بار دہرایا جانے والا عمل ہے۔ جس کا سبب انسان کی لاپرواہی، صنعتی سرگرمیوں، اور فطرت کے غلط استعمال ہے جس کی وجہ سے ''خاک''، یعنی مٹّی اپنی زرخیزی کھو رہی ہے۔ یہ تباہی صرف مٹّی تک محدود نہیں، بلکہ اس نے پوری فطرت اور انسانی زندگی متاثر کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں فصلیں تباہ ہو رہی ہیں، جس سے انسانی زندگی اور خوراک کی فراہمی کے مسائل جنم لے رہے ہیں۔

ایم جے خالدؔ کی شاعری میں یہ خوبی نمایاں ہے کہ وہ سائنسی فکر کو وجودی سوالات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا فن بھی جانتے ہیں، جو ان کی غزل کو عصر حاضر میں مختلف شناخت عطا کرتی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیات میں کائنات کی عظمت اور انسانی وجود سے اس کے تعلق کا ذکر بھی ایک مخصوص انداز میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے:

ایک پہلو یہ بھی تھا سوداستاں میں آ گیا　　　خاک کا اک پیرہن اور وہ بھی سیارہ نفس

یہ شعر انسانی جسم کی مادیت ''خاک''، اور شعور کی کائناتی وسعت ''سیارہ نفس'' کے درمیان تعلق کو شاعرانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ ماہرین کے مطابق انسانی جسم کائنات کے بنیادی عناصر ''کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن'' سے بنا ہے، جو ستاروں کے اندر نیوکلیئر فیوژن کے ذریعے بنے۔ یہ عناصر

13.8 ارب سالہ کائناتی ارتقا کا نتیجہ ہیں، جو Big Bang سے شروع ہوا۔ ''سیارہ نفس''، شعور کی پراسراریت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو دماغ کے 86 ارب نیورانز سے ابھرتا ہے۔ خالدؔ کی غزل کا یہ شعر کائنات کی عظیم داستاں کو شاعری کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ جہاں سائنس مادے کی تشکیل کو سمجھنے کا دعوہ کرتی ہے وہی خالدؔ شعور کی پراسراریت کو ایک ''پہلو'' کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو سائنسی تحقیق کے لیے ابھی تک ایک چیلنج ہے۔ اسی فکر سے مہمیز ایک شعر اور ملاحظہ کریں جس میں خالدؔ نہ صرف سائنسی پیکر تراشی کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں، بلکہ کائنات اور انسان کے درمیان ایک ڈرمائی مقالمہ بھی ان کے شعر کے حسن کو دوبالہ کرتا ہے:

فلک پہ بیٹھ کے فرما رہا ہے صدیوں سے زمیں پہ آ مرے اشکوں کی منزلت بھی دیکھ

غور کریں تو ایم جے خالدؔ کا یہ شعر اپنے خطابیہ انداز میں بہت سی معلومات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے ''فلک'' کو کائنات یا آسمانی نظام (Cosmos) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ کائنات کا وہ عظیم منظر ہے جو ستاروں، سیاروں، کہکشاؤں، اور وقت و مکان کے وسیع ڈھانچے پر مشتمل ہے۔ شعر میں آیا جملہ ''فرما رہا ہے صدیوں سے'' یہ کائنات کے مستقل اور ابدی قوانین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کائنات کے قوانین مثلاً'' نیوٹن کے قوانین حرکت، آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت، یا کوانٹم فزکس کے اصول'' لاکھوں کروڑوں سالوں سے نافذ ہیں اور کائنات کے ہر عمل کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ قوانین اس بادشاہ کے فرمان کی طرح ہیں جس کو اس کے فرمانے کے بعد نافذ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اس کائنات کے وجود میں آنے کے بعد یعنی اس کے ''فرمانے کے بعد'' کائنات کے نظام کو ایک مستقل پیغام کے طور پر ترتیب دے دیا گیا ہے۔ شعر میں آیا لفظ ''صدیوں سے'' یہ وقت کی طوالت کو ظاہر کرتا ہے۔ سائنسی تناظر میں، کائنات کی عمر Big Bang کے بعد سے تقریباً 13.8 ارب سال ہے۔ اور یہ ہمیں کائنات کی اس عظیم وقتی پیمانے (cosmic timescale) کی یاد دلاتا ہے، جو انسانی زندگی کے مقابلے میں ناقابلِ فہم حد تک وسیع ہے۔

شعر کے دوسرے مصرعے میں آئے الفاظ ''زمیں پہ آ'' یہ کائنات کے عظیم تناظر سے زمین کی طرف، یعنی ایک چھوٹے سے سیارے پر انسانی وجود کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ سائنس کے مطابق، زمین کائنات کے وسیع نظام میں ایک معمولی سی دھول کا ذرے کے برابر ہے، لیکن یہ وہ واحد جگہ ہے جہاں زندگی کا منظم نظام موجود ہے۔ دوسری طرف ''اشکوں کی منزلت'' کو انسانی وجود، اس کی نزاکت، اور اس کے جذبات کی اہمیت سے جوڑا جا سکتا ہے۔

مجموعی طور پر خالدؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بظاہر اس کائنات میں انسان کا وجود عارضی اور بہت چھوٹا سا ہے، لیکن اس کے جذبات، شعور، اور تجربات اسے ایک منفرد مقام دیتے ہیں۔ یہ شعور (consciousness) ایک ایسی چیز ہے جس کو سائنس ابھی تک پوری طرح حل نہیں کر سکی ہے۔ کائنات اور انسان کے درمیان خطابیہ لہجہ اور ڈرمائی انداز بھی ایم جے خالدؔ کی شاعری میں منفرد انداز میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ شعر دیکھیں:

ایک میں ہوں، ایک تو اور تیسرا کوئی نہیں انتہا یہ ہے کہ اس کی انتہا کوئی نہیں

''ایک میں ہوں، ایک تو'' سائنسی طور پر، اس مصرعے کو ہم انسانی شعور (consciousness) اور کائنات کے درمیان تعلق سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ''میں'' انسانی شعور یا انفرادی وجود کی نمائندگی کرتا ہے، جو دماغ کے نیورانز کے پیچیدہ جال (neural network) کا نتیجہ ہے۔ ''تو'' کو ہم کائنات، فطرت، یا اس عظیم حقیقت سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو ہمارے وجود سے باہر ہے۔ یہ دونوں انسانی شعور اور کائنات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہمارے جسم کے تمام عناصر کاربن، آکسیجن وغیرہ ستاروں کے اندر بنے ہیں، جو ہمیں کائنات کا ایک حصہ بناتے ہیں۔ ''تیسرا کوئی نہیں'' یہ لفظ کائنات کے بنیادی اتحاد (unified nature) کی عکاسی کرتا ہے۔ کوانٹم فزکس کے مطابق، کائنات کے تمام ذرات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں مثلاً quantum entanglement کے ذریعے، اور ساری کائنات ایک ہی بنیادی قوانین جیسے فزکس کے قوانین کہتے ہیں اس کے تحت چلتی ہے۔ اس طرح ''تیسرا کوئی نہیں'' اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کائنات اور انسانی شعور کے علاوہ کوئی تیسری حقیقت الگ سے موجود نہیں سب کچھ ایک ہی نظام کا حصہ ہے۔ شعر میں آیا فقرہ ''اس کی انتہا کوئی نہیں'' یہ کائنات کی لامحدودیت اور اسرار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور بات کی طرف ذہن مرکوز کرتا ہے کہ سائنس ابھی تک کائنات کے بہت سے رازوں جیسے ڈارک میٹر، ڈارک انرجی، یا کائنات کی ابتدا اور انجام کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکی ہے۔ خالدؔ کا یہ شعر سائنسی تحقیق کی اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ ہر نئی دریافت کے ساتھ نئے سوالات جنم لیتے ہیں، اور علم کی کوئی حتمی ''انتہا'' نہیں ہے۔ ایم جے خالدؔ اس بات پر بھی عبور رکھتے ہیں کہ وہ اپنے خطابیہ انداز میں بہت سی سائنسی حقائق کو دلکش پیرائے میں ڈھال کر بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

بتائیں کیا کہ ہم سب فاسفورس کے سفر میں ہیں
یہی ہے کھیل جو صدیوں سے روز و شب میں یکساں ہے

ماہرین کے مطابق فاسفورس ایک بنیادی کیمیائی عنصر ہے جو زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ ڈی این اے (DNA) اور آر این اے (RNA) کے بنیادی ڈھانچے کا حصہ ہے، کیونکہ یہ فاسفیٹ گروپس کی شکل میں ان مالیکیولز کی ریڑھ کی ہڈی (backbone) بناتا ہے۔ فاسفورس توانائی کے مالیکیول اے ٹی پی (ATP) کا بھی ایک اہم جزو ہے، جو خلیوں کے لیے توانائی کا بنیادی ذریعہ ہے۔ کائناتی تناظر میں فاسفورس کی اصل کائنات کے ستاروں سے جڑی ہے۔ یہ ستاروں کے اندر نیوکلیئر فیوژن (nuclear fusion) کے عمل سے بنتا ہے اور سپرنووا دھماکوں (supernovae) کے ذریعے کائنات میں پھیلتا ہے۔ زمین پر موجود فاسفورس اسی کائناتی ''سفر'' کا نتیجہ ہے، جو اربوں سال پہلے ستاروں سے شروع ہوا اور اب ہمارے جسموں اور زمین کے ماحولیاتی نظام کا حصہ ہے۔ اس تناظر میں، ''فاسفورس کا سفر'' کائناتی ارتقا (cosmic evolution) اور زندگی کی ابتدا کی عکاسی کرتا ہے، جو ہم سب کو کائنات سے جوڑتا ہے۔ حیاتیاتی تناظر میں ''فاسفورس'' زمین پر زندگی کے چکر (biogeochemical cycle) کا حصہ ہے، جہاں یہ پتھروں سے پودوں، جانوروں، اور انسانوں تک منتقل ہوتا ہے۔ یہ ''سفر'' ہر جاندار کے وجود کا ایک بنیادی حصہ ہے، کیونکہ یہ زندگی کے مالیکیولز کو استحکام دیتا ہے۔ خالدؔ اپنے اس شعر کے ذریعے اس بات کی یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ہم سب اس کائناتی اور حیاتیاتی سفر کا حصہ ہیں، جو ہمارے وجود کو کائنات کے عظیم نظام سے جوڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایم جے خالدؔ نے شعر میں ''بتائیں کیا'' کہہ کر ایک وجودی سوال قائم کیا ہے جو ہمیں اپنے وجود کے مقصد اور کائنات میں اپنی جگہ پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہمارا وجود کائنات کے بڑے نظام کا ایک حصہ ہے، اور ہم اس کے قوانین اور عمل جیسے ''فاسفورس کے چکر'' یعنی کائنات کے قوانین کے اس کھیل کے طابع ہیں۔ یہ فطرت کے بنیادی اصولوں (laws of physics) اور حیاتیاتی نظاموں کے تسلسل کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو وقت کے ساتھ مستقل قائم رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر، فوٹو سنتھیسز، تنفس، اور فاسفورس کا چکر (phosphorus cycle) اربوں سالوں سے جاری ہیں اور زمین پر زندگی کو برقرار رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔

خالدؔ کی غزلوں میں وقت کی عارضی فطرت اور انسانی شعور کی وجودی جستجو بھی اہم مقام رکھتی ہے۔ جب وہ اپنے ایک شعر میں وقت کو سایہ سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کو مکاں سے لامکاں میں آنے کا ذکر کرتے ہیں۔ تو ذہن فوری طور پر آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی طرف مرکوز ہوتا

ہے۔شعر ملاحظہ کریں:

وقت کا سایہ مکاں سے لامکاں میں آ گیا ایک حرفِ نا تراشیدہ بیاں میں آ گیا

یہ شعر آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت (Theory of relativity) سے منسلک نظر آتا ہے، جہاں وقت مادے اور توانائی کے ساتھ جڑا ہے۔''مکاں سے لامکاں'' کائنات کے محدود قابل مشاہدہ فاصلے یعنی 93 ارب نوری سال اور لامتناہی وسعت مثلاً ملٹی ورس یا ڈارک انرجی کے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''حرفِ ناتراشیدہ'' سائنسی نظریات کی ابتدائی شکل کی عکاس ہے، جو تجربات کے ذریعے واضح ہوتے ہیں۔ایم جے خالدؔ کی شاعری محض حسین لفظیات کا بہترین استعمال ہی نہیں بلکہ وہ اپنے اشعار کے ذریعے غور وفکر اور تحقیق کرنے کے لئے نئے جہان معنی کے در بھی وا کرتے ہیں، جس سے قاری کی فہم وادراک متحرک ہوتی ہے۔کبھی وہ کائنات کے پوشیدہ رازوں کو سمجھنے کی تو کبھی انسان کے بدن میں موجود اسرار کی گتھی کو حل کرنے کی بات کرتے ہیں۔اس طرح ان کی غزلیات میں انسانی شعور کی پراسراریت بھی ایک اہم موضوع بن کر ابھرتی ہے:

سب مسئلے حل ہو گئے اک آن میں خالدؔ اک گتھی جو سلجھی نہیں اسرار بدن ہے

یہ شعر شعور کی نوعیت کو سائنسی تحقیق کے لئے سب سے بڑے چیلنج کے طور پر پیش کرتا ہے۔ نیوروسائنس کے مطابق، شعور دماغ کے 86 ارب نیورانز اور ان کے رابطوں سے ابھرتا ہے، لیکن اس کی ذاتی نوعیت (qualia) ابھی تک سمجھ سے باہر ہے۔شعر میں آیا لفظ ''اک آن میں'' دماغ کی بصیرت (insight) کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو prefrontal cortex سے پیدا ہوتی ہے۔2025ء میں، نیورو امیجنگ (Neuroimaging) اور مصنوعی ذہانت (AI) شعور کی ماڈلنگ کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ایم جے خالدؔ کا شعر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ شعور کی گتھی ابھی تک نہیں سلجھی ہے۔یعنی موصوف نیوروسائنس کی حدود کو شاعری کے ذریعے اجاگر کر رہے ہیں۔وہ اسے ایک ''اسرار'' کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو ان کی شاعری میں ایک فلسفیانہ گہرائی بھی دیتا ہے اور اسے عصر حاضر کے سائنسی مقالے کا حصہ بھی بناتا ہے۔انسانی شعور کی اسراریت سے متعلق ایک اور شعر ملاحظہ کریں۔جس میں خالدؔ نطق کے کمال کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کمال نطق کا عالم سر منظر نمایاں ہے لچکتی شاخ سے بھی سیکھ، انداز گل افشانی

شعر میں ''کمال نطق'' سے مراد انسانی زبان، شعور، یا ابلاغ کی صلاحیت سے لی جا سکتی ہے۔سائنسی طور پر، یہ انسانی دماغ کی غیر معمولی صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے، جو کہ نیوروسائنس کے

مطابق ہمارے شعور، سوچ، اور زبان کے پیچیدہ نظام کا نتیجہ ہے۔ انسانی دماغ، جو صرف 1.4 کلوگرام وزن رکھتا ہے، کروڑوں نیورانز اور ان کے درمیان اربوں کنکشنز (synapses) کے ذریعے زبان، تخلیقی صلاحیتوں، اور خیالات کو جنم دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شعر میں آیا جملہ ''عالم سر منظر نمایاں ہے'' کائنات کے عظیم منظر یا نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سائنسی تناظر میں، یہ کائنات کا وہ شاندار نظارہ ہے جو ہم ستاروں، کہکشاؤں، اور فطرت کے قوانین کے ذریعے دیکھتے ہیں۔ انسانی نطق یا شعور اس عظیم کائناتی منظر کا ایک حصہ ہے، جو کائنات کے ارتقا (cosmic evolution) سے جڑا ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں آیا ''لچکتی شاخ'' کا استعارہ فطرت کے لچکدار نظام (resilience and adaptability) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پودوں کی شاخیں لچکدار ہوتی ہیں جس کے سبب وہ ہوا، بارش، یا دیگر ماحولیاتی دباؤ کو برداشت کرتی ہیں۔ یہ حیاتیاتی ارتقا (evolution) کا ایک شاندار نمونہ ہے، جہاں پودے اپنی ساخت کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ لچکتی شاخ فوٹوسنتھیسز (photosynthesis) کے عمل سے بھی جڑی ہے، جو سورج کی روشنی کو توانائی میں بدلتا ہے اور زندگی کا بنیادی ستون ہے۔ جب کے ''انداز گل افشانی'' یہ پھولوں کی خوبصورتی اور ان کے پھیلاؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ علم نباتات کے مطابق ''گل افشانی'' سے مراد پودوں کی تولیدی حکمت عملی (reproductive strategy) ہے، جو جرگہ (pollination) کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ عمل کیڑوں، پرندوں، یا ہوا کے ذریعے پھولوں کے جرگ کو ایک سے دوسرے تک منتقل کرتا ہے، جو حیاتیاتی تنوع (biodiversity) کو برقرار رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خالدؔ اپنے اس مصرعے میں ''سیکھ'' کہہ کر قاری کو فطرت کے بارے میں تحقیق کرنے اور اس کے قوانین کو سمجھنے کی بات کر رہے ہیں۔ سائنس میں، بائیومیمیکری (biomimicry) ایک ایسا شعبہ ہے جو فطرت کے ڈیزائن سے متاثر ہو کر انسانی مسائل کے حل تلاش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، لچکتی شاخ سے ہم لچکدار ڈھانچوں (flexible structures) کے بارے میں سیکھ سکتے ہیں، جیسے کہ عمارات یا پل جو زلزلوں کو برداشت کر سکیں۔ اسی طرح، گل افشانی سے ہم فطرت کے توازن اور تعاون (symbiosis) کے اصول سیکھ سکتے ہیں، جو کہ ماحولیاتی نظام (ecosystem) کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔

ایم جے خالدؔ کے کلام میں علمِ نباتات بھی ایک اہم موضوع ہے۔ ان کے اشعار میں آئی لفظیات ''لچکتی شاخ، اندازِ گل افشانی، لالہ و گل، شجر، خورشید، کوہ زار، ہوا، آکسیجن'' علم نبات سے

متعلق اہم معلومات حاصل کرنے کے لئے قاری کو آمادہ کرتی ہے۔ اشعار دیکھیں:

کئی خورشید زندہ ہو اٹھے ہیں لالہ وگل میں پس زنجیر نفساں، چشم تر کی آزمائش ہے

تعلق کوہ زاروں سے شجر سے عہد و پیماں ہے ہوا کا آکسیجن میں بدلنا کوئی آساں ہے

پہلے شعر میں خالدؔ خورشید کا ذکر کر رہے ہیں۔ جو زمین پر زندگی کا بنیادی ذریعہ ہے۔ یہ فوٹو سنتھیسز (photosynthesis) کے ذریعے پودوں کو توانائی فراہم کرتا ہے، جس کی مدد سے وہ آکسیجن اور غذائی توانائی پیدا کرتے ہیں۔ شعر میں آئے الفاظ ''کئی خورشید'' کو ہم سورج کی اس توانائی سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو پودوں ''لالہ وگل'' میں زندگی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے یہ شعر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کائنات کے عظیم ستاروں جیسے سورج سے نکلنے والی توانائی زمین پر حیاتیاتی تنوع (biodiversity) کو جنم دیتی ہے۔ جملہ ''زندہ ہو اٹھے'' اس حیاتیاتی عمل کو پیش کرتا ہے، جہاں سورج کی توانائی پودوں میں زندگی کو متحرک کرتی ہے۔

جب کہ دوسرے مصرعے میں ''زنجیر نفساں'' سے مراد سانس یا زندگی کا عمل ہے، ''زنجیر'' اسے ایک پابندی یا ربط کی علامت بناتی ہے۔ سائنسی طور پر، یہ تنفس (respiration) کے عمل سے جڑا ہے، جو زندگی کا بنیادی جزو ہے۔ تنفس کے ذریعے خلیوں میں آکسیجن سے توانائی (ATP) بنتی ہے، جو ہر جاندار کے لیے ضروری ہے۔ ''زنجیر'' اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہم سب اس حیاتیاتی عمل کے پابند ہیں، اور ہمارا وجود فطرت کے قوانین کے تابع ہے۔

دوسرے شعر میں ''تعلق کوہ زاروں سے شجر سے'' یہ مصرعہ فطرت کے مختلف عناصر پہاڑ (کوہ)، میدان (زار)، اور درخت (شجر) کے ساتھ گہرے تعلق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سائنسی طور پر، یہ زمین کے ماحولیاتی نظام (ecosystem) کی باہمی ربط (interconnectivity) کی عکاسی کرتا ہے۔ پہاڑ زمین کی ٹیکٹونک سرگرمیوں (tectonic activity) کا نتیجہ ہیں، جو ماحول کو شکل دیتے ہیں اور موسمیاتی نمونوں (weather patterns) کو متاثر کرتے ہیں۔ زار یا میدان حیاتیاتی تنوع (biodiversity) کے مراکز ہیں، جہاں مختلف جاندار اپنی بقا کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ درخت فوٹوسنتھیسز (photosynthesis) کے ذریعے آکسیجن پیدا کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتے ہیں، جو زمین پر زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ سائنسی تناظر میں، یہ فطرت کے توازن (ecological balance) اور اس کے قوانین کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو تمام جانداروں کے درمیان ایک تعلق پیدا کرتا ہے۔ جب کہ دوسرا

مصرعہ ''ہوا کا آکسیجن میں بدلنا کوئی آساں ہے''۔فوٹوسنتھیسز کے عمل کی طرف براہ راست اشارہ کرتا ہے، جو سائنسی طور پر ایک پیچیدہ اور حیرت انگیز عمل ہے۔اس عمل میں پودے سورج کی روشنی، کاربن ڈائی آکسائیڈ، اور پانی کا استعمال کرتے ہوئے گلوکوز (غذائی توانائی) اور آکسیجن بناتے ہیں۔یہ عمل زمین پر زندگی کے لیے بنیادی ہے، کیونکہ یہ آکسیجن فراہم کرتا ہے، جو سانس لینے کے لیے ضروری ہے، اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو ہٹا کر ماحول کو متوازن رکھتا ہے۔ایم جے خالدؔ کی غزلوں میں قدرت کی دوہری فطرت یعنی ''خوبصورتی'' اور ''تباہی'' بھی نمایاں ہے۔شعر دیکھیں:

دے رہا ہے موج صادق کا پتہ پانیوں پہ تیرتے پیکر کا شور

یہ شعر سمندری حرکیات اور زندگی کی ابتدا سے جڑا ہو معلوم ہوتا ہے۔''موج صادق'' کو سمندری لہروں یا گریویٹیشنل ویوز کے استعارے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔جو کائنات کی سچائیوں کا پتہ دیتی ہے۔''پانیوں پہ تیرتے پیکر'' سمندری ماحولیاتی نظام یا پلینکٹن (Plankton) کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو زندگی کی ابتدا کے لیے اہم ہیں۔جیوفزیکس کے تناظر میں، یہ پانی کی حرکی توانائی (kinetic energy) سے جڑتا ہے، جو زندگی کو سہارا دیتی ہے لیکن سیلاب جیسے تباہ کن مظاہر بھی پیدا کرتی ہے۔مجموعی طور پر یہ شعر فطرت کی خوبصورتی اور اس کی طاقت کو شاعرانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔لیکن اس کا وجودی زاویہ سائنسی تفہیم سے آگے کی بات کرتا ہوا نظر آتا ہے۔جہاں سائنس پانی کی حرکیات کو ناپتی ہے، وہیں خالدؔ اس کے ''شور'' کے پیچھے چھپی سچائی پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں، جو شعر کو ایک گہرا فلسفیانہ رنگ دیتی ہے۔ایم جے خالدؔ طوفان آنے کے عمل کو بھی مثبت انداز میں پیش کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا ماننا ہے کہ طوفان آنے سے بھی بہت سے پوشیدہ زار آشکار ہو جاتے ہیں:

طوفان کوئی مدمقابل جو آ گیا سربستہ ہائے زاز نسیم سحر کھلے

سائنسی نقطہ نظر سے ''طوفان'' ایک طاقتور قدرتی مظہر ہے، جو ماحولیاتی نظام (weather systems) میں عدم استحکام کی جیسے کہ کم دباؤ کے علاقے، درجہ حرارت اور نمی کے شدید فرق کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔یہ کائنات کے بڑے تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، جس کو ستاروں کے اندر ہونے والے دھماکوں (supernovae) یا کہکشاؤں کے تصادم (galactic collisions) سے بھی تشبیہ دی جاسکتی ہے۔لیکن اس کے آنے سے بہت سے پوشیدہ رازوں اور کائنات کے اصولوں کے بارے میں بھی پتا چلتا ہے۔''سربستہ ہائے زاز'' سے مراد بند یا چھپے ہوئے راز ہیں جس کو

کائنات کے چھپے ہوئے رازوں یا فطرت کے غیر دریافت شدہ اصولوں سے تعبیر دی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر، کائنات کے ڈارک میٹر اور ڈارک انرجی، جو کہ کائنات کا 95% حصہ بناتے ہیں، ابھی تک ''سربستہ'' ہیں، یعنی ہم ان کے بارے میں مکمل طور پر نہیں جانتے۔لیکن جب کوئی خلاء میں بڑا دھماکہ یا ہل چل ہوتی ہے تو سائنسدانوں کو کائنات کے وجود سے متعلق نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔مجموعی طور پر یہ شعر فطرت اور انسانی زندگی میں تبدیلی اور بحالی کے عمل کو سائنسی زاویے سے بیان کرتا ہے۔''طوفان'' کائناتی یا انسانی زندگی میں اچانک آنے والی تبدیلیوں کی عکاسی کرتا ہے، جو نظام کو ہلا دیتا ہے۔لیکن ''نسیم سحر'' اور ''سربستہ ہائے راز'' کے کھلنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر تبدیلی کے بعد نئے امکانات اور بحالی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

الغرض ایم جے خالدؔ کی غزلیات عصر حاضر میں سائنسی فکر کو شاعری کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس صنف کو نئے معنی عطا کرتی ہیں۔ان کی شاعری میں وسیع مطالعہ، کائناتی مشاہدہ، اور ماحولیاتی شعور جھلکتا ہے، تاہم، ان کی شاعری محض سائنسی نظریات کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ وجودی سوالات کو بھی اٹھاتی ہے، اور سائنسی حدود سے آگے کی بات بھی کرتی ہوئی معلوم دیتی ہے۔ان کی غزلیات جدید تراکیب، علامتوں، اور متنوع مضامین کا حسین امتزاج ہیں، موجودہ وقت میں، ایم جے خالدؔ کی شاعری نہ صرف ادبی دنیا میں ایک عظیم اضافہ ہے بلکہ سائنسی اور فلسفیانہ مکالمے کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔ایم جے خالدؔ واقعی عصر حاضر کے وہ شاعر ہیں جو غزل کو صرف سائنسی فکر سے مزین ہی نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان کی شاعری آنے والی نسلوں کے لیے ایک روشنی کا مینار کا بھی رتبہ رکھتی ہے۔

☆☆☆

Parvin Shakir : Nisai Ehsas ki Shaira by Zahid Ahmad Bhat

(Research Scholar, dept. of Urdu, Central University of Kashmir)
زاہد احمد بٹ (ریسرچ اسکالر، شعبہء اردو، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، گاندربل)

پروین شاکر: نسائی احساس کی شاعرہ

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کا نام اتے ہی ذہن میں اردو شاعری خاص کر غزل کے سُر، نظم کی روانی اور شاعری کی تہذیبی رچاؤ گونجنے لگتی ہے۔ جس طرح صوفی تحریک، دہلی سلطنت، مغل دور اور جدید تعلیم نے اردو زبان کی ترقی میں کلیدی رول ادا کیا اسی طرح اردو شاعری نے بھی اس زبان کی شان وشوکت میں چار چاند لگانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اردو ادب کے عظیم تخلیق کاروں اور شاعروں نے اپنی نثری اور شعری کاوشوں سے اس زبان کو بقائے دوام کی شہرت بخشی ہے۔ شاعروں اور ادیبوں نے جہاں عشق ومحبت، مذہب وروحانیت، فطرت و ماحول، فلسفہ و حکمت ا، خلاقیات واقدار اور تاریخ وتہذیب جیسے عمدہ موضوعات پر بات کی وہی جدید دور میں انسان کی ذات کو بھی بحث ومباحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ جہاں تک شعراء کی بات کی جائے تو کچھ نے براہ راست اور واضح طریقے سے ان موضوعات پر روشنی ڈالی جب کہ کچھ نے زیادہ تجریدی اور علامتی انداز میں ان کا احاطہ کیا ہیں۔

اردو ادب کے سرمائے میں مرد حضرات کے دوش بدوش جن خواتین نے بیش بہا اضافہ کیا ہے ان میں ایک نام پروین شاکر کا بھی ہے۔ اپ کا تعلق متوسط طبقے کے ایک سادات خاندان سے تھا۔ اپ کے آبا واجداد کا تعلق ہندوستان کے صوبہ بہار میں ہیر پاسرائی دربنگہک کے نزدیک محلہ چندل پٹی سے تھا والد کا نام سید شاکر حسین اور تخلص ثاقب تھا۔ شاکر صاحب 20 سال کی عمر میں سید مجاہد حسین کے ساتھ قیام پاکستان سے پہلے کراچی ہجرت کرتے ہیں۔ بقول پروین شاکر:

"میرے والدین جون 1947 عیسوی میں بہار سے کراچی ہجرت کر کے اگئے۔ قبل از وقت آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ آزادی صبح آزاد سرزمین پر دیکھیں"

(مضمون خوشبو کی سفری از اوبی س یل۔ مشمولہ خوشبو پھول تحریر کرتی ہے۔ مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش)

آپ کی پیدائش 24 نومبر 1952 عیسوی کو کراچی میں ہوئی۔خوشبوؤں کو بکھیرنے والی اورنسائی احساس کی ملکہ پروین شاکر دنیا کی اس عارضی رنگ و بو کا حصہ زیادہ دیر تک نہ رہی 42 سال کی عمر میں ایک سڑک حادثے میں اس دنیا سے کوچ کرتی ہے۔اردو شاعری میں عورت اور اس کے مسائل پر مرد حضرات سے زیادہ صنف نازک نے اس پہلو کو زیر بحث لایا ہے۔فیض احمد فیض ،فخر زمان ،منیر نیازی اور جاوید اختر جیسے سنہ وروں نے اس رنگ میں خود کو تھوڑا سا رنگ لیا۔جبکہ شاعرات میں فہمیدہ ریاض ،بلقیس ظفر،ساجدہ زیدی،کشور ناہید اور پروین شاکر نے اس ضمن میں کلیدی رول ادا کیا۔

پروین شاکر دور جدید کی ایک معروف خاتون شاعرہ ہے۔یہ اردو ادب کا وہ دور تھا جب شاعری کے موضوعات میں رنگا رنگی اور تبدیلی دیکھنے کو ملی۔روایتی موضوعات کے علاوہ اس دور میں نئے اور متنوع موضوعات بھی شاعری میں متعارف کرائے گئے۔عشق اور محبت جیسے مرکزی موضوع کے علاوہ معاشرتی اور سیاسی مسائل ،فطرت ، روحانیت اور عورت کے مسائل پر بھی قلم کشی کی گئی۔پروین نے جہاں حسن و عشق کے نغمے لکھے وہی مظلوم عورت پر ہونے والے مظالم پر بھی قلم اٹھایا۔انہوں نے عورت پر ہونے والی استحصال کو بڑی ہمت اور ہنرمندی کے ساتھ بیان کیا۔اور اپنی شاعری میں عورت کے مقام کو ایک خاص موضوع قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک عورت کو معاشرے میں وہ عزت نہیں مل رہی جس کی وہ اصل حقدار ہے۔عورت کی ازادیوں کو یہ معاشرہ ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔جبکہ پروین عورت کو مرد کے برابر اور مساوی دیکھنے کا مطالعبہ کرتی ہے۔نظم" ناٹک" سے چند اشعار ملاحظ کیجئے:

رُت بدلی تو بھنوروں نے تتلی سے کہا — آج سے تم ازاد ہو
پروازوں کی ساری سمتیں تمہارے نام ہوئیں — جاؤ
جنگل کی مغرور ہوا کے ساتھ اڑو — بادل کے ہمراہ ستارے چھواؤ
خوشبو کے بازو تھاموں اور رقص کرو — رقص کرو (نظم،نانک مجموعہ خوشبو)

ان اشعار پر اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پروین نے کس طرح ظالم معاشرے کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔عورت کو دی جانے والی عارضی آزادی کے المیے کو بیان کرتی ہے۔سماج عورت کو آزادی کا خواب دکھاتے اور مختصر وقت کے لیے اس کا تجربہ بھی کرنے دیتے ہیں۔لیکن جیسے ہی وہ اس آزادی کو حقیقت میں برتنے لگتی ہے تو اسے ظلم اور جبر کے ذریعے واپس اپنی مقررہ جگہ پر دھکیل دیا

جاتا ہے۔آزادی کوایک ناٹک قرار دے کرختم کر دیا جاتا ہے۔ پروین کے نزدیک یا معاشرہ صرف عورت کی ظاہری خوبصورتی یعنی شکل وصورت کو ہی اہمیت اور قدر کا واحد معیار سمجھتا ہے جبکہ عورت کا حسین ہونا ہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔عورت میں اور بھی خوبیاں ہیں جو اس کے وجود کو خوبصورت اور قابل قدر بناتا ہے وہ چاہتی ہے کہ سماج اسے اس کی ذہانت صلاحیت اور شخصیت کی بنیاد پر پرکھے نہ کہ اس کی ظاہری صورت پر۔عشق ومحبت پروین کا مرکزی موضوع ہے۔انہوں نے اس موضوع پر کثیر العتد اد اشعار قلم بند کیے ہیں۔ان کے نزدیک عورت ہمیشہ محبت میں فریب اور استحصال کا شکار ہوتی ہے۔اپنی شوہر کے بارے میں کہا تھا:

"نصیر پہلے میرے خالہ زاد بھائی ہیں،اس لیے ان پی پہلے سے سب کچھ معلوم تھا ایسی باتیں پریشانی کا باعث نہیں بنتی ہیں۔انھوں نے تو جہاں ہے جیسی ہے، کے بنیاد پر ٹینڈر کھلوایا تھا"

(اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک، قاضی مشتاق احمد۔ص۔ ۱۴۲)

محبت انسان کے لیے ایک اہم اور بنیادی جذبہ ہے جو انسان کو زندگی کو مختلف طریقوں سے متاثر کرتا ہے۔یہ وہ جذبہ ہے جس میں انسان کو خوشی ،سکون اور تکمیل کا احساس حاصل ہوتا ہے۔محبت انسان میں ہمدردی، رحم اور قربانی جیسی اقدار کو فروغ دینے میں مدد کرتی ہے اور معاشرے پر بھی محبت کا ایک مثبت اثر پڑتا ہے۔مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو محبت ایک طاقتور جذبہ ہے جو انسان کو مکمل اور بہتر بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔لیکن پروین کے ہاں محبت کا ایک الگ ہی رخ نظر آتا ہے۔شاعرہ محبت میں فریب اور غداری کے اپنے ذاتی تجربے کا اظہار کرتی ہے۔وہ اس بات کا درد اور مایوسی بیان کرتی ہے کہ جب کوئی ایسا شخص جس پر آپ کو خود سے بھی زیادہ اعتماد ہوتا ہے اور وہ آپ کے ساتھ فریب کرتا ہے تو یہ تجربہ تباہ کن ہوتا ہے۔اور اس سے نمٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

پروین اصل میں غزل کی شاعرہ ہیں۔ان کے یہاں جہاں روایتی رنگ و بو کی خوشبو ملتی ہے وہی جدید موضوعات جیسے عشق و رومانیت ،سماجی مسائل، ذاتی تجربات و احساسات، سماجی شعور ،وجودیت اور نسائی احساس وغیرہ موجود ہیں۔بقول قاضی مشتاق احمد:

"غزل کی دنیا میں پروین شاکر ایک عہد آفرین شاعرہ بن کر آئیں اور اپنی نسوانی اواز ، چونکا دینے والے اسلوب سے اردو شاعری میں ہلچل مچادی۔ پروین شاکر کی شاعری میں صنف نازک کی بیچارگی اور بے بسی کا ایسا درد بھرا ہوا ہے۔جو اس ہرنی کے انداز سے بھرا ہوا ہوتا ہے جو چاروں طرف سے شکاریوں سے گری چکی ہو اور بیچارگی اور بے بسی سے نتھنے کو رگڑ رہی ہو۔چوں کہ غزالہ کے معنی ہرنی

ہوتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں اس صنفِ سخن کو غزل کہا جانے لگا"(ایضاً،ص 141)

پروین نے نہ صرف غم ذات کو ترجیح دی بلکہ روح اثر کے حالات اور غم کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا۔ وہ سماج میں خواتین کی اذیت، غم اور تکالیف کی صحیح نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں خواتین کے حقوق اور ان کے جذبات و احساسات کی جو تصویریں ملتی ہے وہ شاید ہی اردو شاعری میں کسی اور کے یہاں نظر آتی ہے۔ خلیل الزمان نصرت یوں رقمطراز ہے:

"پروین شاکر کی غزلوں میں نسوانیت کی وہ چیخ چھپی ہوئی ہے جو ایک غیر مطمئن روح سے ابھری ہے جو ایک طرف شاخ گل ہے تو دوسری طرف تلوار بھی ہے۔ انسانی سماج کی ایک عام عورت جو رشتوں میں بندی ہوئی ہے۔ ایک ایسی شاخ گل جس پر مرجھائے ہوئے باسی پھول ٹنگے ہوئے ہیں۔ ازدواجی زندگی کی باخوشی اور عدم توازن کے سبب ان غزلوں میں نسوانی جذبات کی حقیقی عکاسی تو ملتی ہے لیکن ایسی عکاسی جو ایک با اختیار صاحب وسیلہ نسائیت کا عکس ہو، اس کے عہدے پر فائز ایک ایسی با اختیار تلوار کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے جس میں رزمیے کی نہیں مرثیے کی لے پائی جاتی ہے۔ جنس کی نا آسودہ ترکیب کا اظہار پایا جاتا ہے"(ایضاً،ص ۲۴۲)

پروین شاکر کی شاعری میں اس کا وسیع مطالعہ، پروین کے ذاتی جذبات، تجربات اور مشاہدے کی گہرائی جھلکتی ہے ان سے پہلے فیض احمد فیض، فخر زمان، منیر نیازی اور جاوید اختر جیسے شعرا ء نے زیادہ تر نسائی جذبات کا اظہار کیا تھا۔ لیکن پروین ایک ایسی بہادر اور بے خوف شاعرہ ہے جس نے اپنے نازک جذبات کا برملا اظہار کیا ان کے یہاں نسوانی کردار کی پیشکش ان کی انفرادیت کی عکاس سے ہے کیونکہ انہوں نے شاعری میں اپنی حقیقی ذات کو پیش کیا۔ انہوں نے وہی کچھ لکھا جس کا اس کو تجربہ ہوا تھا۔ اگرچہ پروین شاکر کو بہت کم وقت ملا اردو ادب کی خدمت کے لیے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایک منفرد لب و لہجے اور مختلف خاسلات سے اردو شعری ادب کے دامن کو اتنا وسعط کر دیا جسے کبھی بلا دیا نہیں م جا سکتا۔ خوشبو کی اس شاعرہ نے اتیخ شعری کائنات خلق کی جس سے نہ صرف ان کی اپنی الگ شناخت قائم و دائم ہوگئی بلکہ اس کو پڑھنے والوں کو بھی معطر کر کے ایک نئی روح بخش دی۔

پروین شاکر کے پانچ شعری مجموعے خوشبو، صد برگ، خود کلامی، انکار اور کف آئنہ، ان کے بعد ماہ تمام کے نام سے ان کا کلارت شائع ہوا۔ ان کے کلام کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف اردو کو ہی ذریعہ وسیلہ بنایا بلکہ ہندی، انگریزی، عربی اور فارسی کے الفاظ سے بھی اپنی شاعری

کومزین کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

پروین شاکر نے عورت کے ہر اس روپ میں جینے کی کوشش کی جس میں وہ کبھی بینے، کبھی بوخی اور کبھی ماں کی شکل میں سامنے اکر سبھی کا حق ادا کرتی ہے۔ایک طرف جہاں وہ اس دنا گ سے بزعار ہوکر مردوں کے ظلم و جبر کے خلاف جنگ کرتی نظراتی ہے، وہی دوسری جانب ماں بن کر بچوں کے لیس ممتا کے پھول برسا کر طفلانہ انداز مس دبات کرنے کا احساس دلاتی ہیں۔خر اردو شاعری مس پروین شاکر کو جو مقام حاصل ہے وہ بلا شبہ اس کی مستحق ہے۔ان کیشعری کائنات سے اردو ادب اور خاص کر اردو شاعری کو جو فیض حاصل ہوا وہ نا قابل فراموش ہے۔اس صنف نازک کا اچانک حادثے کا شکار ہونا اور اس دنیا سے پردہ کرنا نہ صرف ان کے اہل وراست کے لئے نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا کے لئے ایک بہترین جھٹکا ہے۔

☆☆☆

Gojri Tahzeeb-o-Saqafat by Shazia Mumtaz M.A.(Dept. of Gojri & Pahadi BGSBU, Rajouri)

شازیہ ممتاز ایم۔اے۔(شعبہء گوجری اور پہاڑی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری)

گوجری تہذیب وثقافت

اللہ تعالی نے انسان نا اشرف المخلوقات بنائیو ہے۔تمام انساناں نا ایک جئ عقل تے شعور توں نوازیو ہے۔کسے نا بھی دوجا توں کم تر نہیں بنائیو۔ یہ قوم،قبیلہ صرف شناخت واسطے ہی ہیں۔اصل معناں ما اگر دیکھیو جائے تے کسے بھی قوم نا دوجی اپر برتری حاصل نہیں ہوتی۔لیکن ہر ایک قوم کی اپنی بکھ پہچان ہوئے،اپنوا پنواٹھ بیس،کھان پین، پہناوؤ تیر ہن سہن کو طریقو ہوئے۔

ہر قوم کی اپنی تہذیب ہوئے۔جس کی بنیاد پر اس قوم نا دوجی قوماں نالوں بکھ کیو جا سکے۔پھر یاہ ہی تہذیب نسل در نسل اگے چلتی رہوے۔یاہ ایک قوم کی میراث ہوئے جس نا سنمبھال کے رکھنو ضروری ہوئے۔کیوں جے تہذیب کسے بھی قوم کی پہچان ہوئے۔گوجری تہذیب وثقافت بارے گل کرن توں پہلاں ہمناں تہذیب وثقافت بارے جاننو ضروری ہے۔انگریزی زبان ما تہذیب کے واسطے ' کلچر ' کی اصطلاح استعمال ہوئے۔کلچر 'لاطینی زبان کو لفظ ہے جس کا لغوی معنی ہیں زراعت،شہد کی مکھیاں،ریشم کا کیڑاں،سیپاں اور بیکڑیا کی پرورش یا افزائش کرنو۔جسمانی یا ذہنی اصلاح و ترقی،کھیتی باڑی کرنو" اردو،فارسی اور عربی ما کلچر کے واسطے ' تہزیب ' کو لفظ استعمال ہوئے۔تہذیب عربی زبان کو لفظ ہے۔اس کا لغوی معنی ہیں کسے درخت یا پودا نا کپنو،چھانٹنو،تراشنو تا کہ اس ما نوی شاخ نکلیں۔ثقافت عربی زبان کو لفظ ہے جس توں مراد کسے قوم یا طبقہ کی تہذیب ہوئے۔کسے بھی مخصوص قوم کا رسم ورواج،رہن سہن کو طریقو وغیرہ سب ثقافت ما آوے۔تہذیب و ثقافت یعنی وہ رسم ورواج اور طور طریقہ جہڑا مھاری زندگی پر حکم فرما ہیں۔تہذیب وثقافت کسے بھی قوم کا تشخص کی اصل بنیاد ہوئے۔قوم کی ثقافت اس نا ترقی یافتہ،باوقار بناوے۔اگر کسے قوم کی ثقافت زوال کی شکار ہو جائے یا اپنو ثقافتی تشخص کھو جائے تے واہ قوم اپنا ذاتی مفاد کی حفاظت نہیں کر سکتی۔دنیا کی تمام ترقی یافتہ قوم اس گل پر متفق ہیں کہ اگر کسے قوم نے اپنی ثقافت کی حفاظت نہیں کی

اس قوم کی کوئے پہچان نہیں رہ سکتی۔ثقافت کا دو حصہ کیا جا سکیں ایک وہ جہڑ و ظاہری طور پر نظر آوے۔جس را لباس، کھان پین، رہن سہن وغیرہ۔عوامی ثقافت کو دو جو حصو جہڑ و کہ ظاہری طور پر نظر نہیں آتو۔جس را اخلاقیات کسے بھی معاشرہ کا لوکاں کی ذاتی اور سماجی زندگی کو طور طریقو کیسو ہے۔

انسان نے جس ویلے اس زمین پر پہلو قدم رکھیو تے اس تیہاڑے توں اس کا ذہنی ،تہذیبی، سماجی، اور معاشی ارتقاء کو سفر شروع ہوؤ۔اج انسان فطری، اور افسانوی دنیا توں نکل کیجد ید سائنسی اور حقیقی دنیا ما داخل ہو گیو ہے۔اج پرانی ثقافت نے بھی دم توڑ شڑ یو ہے۔اور انسان ایک نوا ثقافتی اور تہذیبی ارتقاء کی طرف چل رہیو ہے۔قدیم زمانہ ما انسان بھی ننگے پیر زمین پر چلے تھو۔آدمی کو طور طریقو بھی جانوراں ہاروں تھو۔اس کی سوچ اور اس کو ذہن بھی حیواناں ہاروں تھو۔فر آہستہ آہستہ جس ویلے اس نے سماج مار ہنو سکھ لیو تے اس طرح تہذیب کی شروعات ہوئی۔خاص طور پر اگر ہم گوجر قوم کی گل کراں تے زیادہ تر تاریخدا ناں کو اسے پر اتفاق ہے کہ ہندستان ما گوجر قوم وسط ایشیا توں آئی۔گوجر قوم ہندستان کی ایک قدیم قوم ہے۔ہندستان ما گوجراں نے اپنی آبادی ایک وسیع علاقہ پر بسائی۔تاریخ توں پتو چلے کہ چھیویں صدی تو لے کے تیرہویں صدی تو ڑی ہندستان کا مختلف علاقہ پر گوجراں نے حکومت کی۔تہذیبی سطح پر دیکھیو جائے تے ظاہر ہے کہ وسط ایشیا ما بھی انھاں کی اپنی کوئے مخصوص تہذیب ہوئے گی۔لیکن وقت گزرن کے نال نال اج انھاں کی اصل تہذیب کی شناخت کرنی مشکل ہے۔لیکن تاریخ کی کجھ کتاباں توں ان کی تہذیبی شناخت کا حوالہ سنگ دو چیز اج بھی ثابت ہوئیں ایک سورج کی پوجا تے دو جو مال مویشی نال پیار۔پھر جس ویلے یہ ہندستان ما داخل ہوئیا ات مختلف تہذیباں نال رل کی ان کی تہذیب ما بھی فرق آتو گیو۔ہندسان کا مختلف علاقاں ما گوجر لوک آباد ہیں۔لیکن تہذیبی سطح پر ان کی تہذیب ما تھوڑو بہت فرق ہے۔کیوں جے انھاں کو مختلف مزہباں نال تعلق ہے۔انھاں پر مختلف تہذیباں کا اثرات ہیں اس کی وجہ توں انھاں کی تہذیب ما بھی فرق دیکھن نا لبے۔دو جی قوماں ہاروں گوجر قوم کی بھی اپنی بکھ تہذیب ہے۔خاص طور اپر اگر ہم جموں کشمیر کی گل کراں تے علاقہ پونچھ، راجوری، اوڑی، کرناہ، بارہمولہ، کنگن، گاندربھل، وغیرہ کئی علاقاں ما گوجر تے پہاڑی قوماں کا لوک خاصی تعداد ما آباد ہیں۔ان لوکاں کی تہذیب بھی سانجی ہے۔یاہ دور دراز پہاڑاں ما رہن آلی قوم جفاکش، دلیر تے بہادر ہے۔انھاں لوکاں نے صدی گزارن تو بعد بھی اپنو رسم و رواج، زبان، تے تہذیب وثقافت ناسمبھال کے رکھیو ہے۔گوجر قوم کا لوک گرمیاں کا موسم ما میدانی علاقاں بچوں نکل کے اپنا مال مویشی نالے کے

دور پہاڑاں ماجا کے بس جائیں۔جنھاں ناڈھوک تے بہک کہیو جائے۔ویہ لوک اپنو کھان پین، تے رہن سہن کو سامان اپنا کندھاں اپر یا پھر گھوڑاں اپر لے جائیں۔ک ءمیل کا سفر ما انھاں نا کئی مشکلات تے دشواری بھی آویں۔کئی بار جنگلی جانور انھاں نا تے انھاں کا مال مویشی نا خاصو نقصان بھی پہچاویں۔لیکن یہ لوک ان سب چیزاں کو مقابلو کر کے اپنی ثقافت نا زندہ رکھیں۔ڈھوکاں تے بہکاں ما پہچ کے یہ لوک ات کا خوشگوار ماحول،صاف تازی ہوا،صاف وشفاف پانی،خوبصورت جنگلاں نا دیکھ کے ایک بکھ قسم کی خوشی تے سکون محسوس کریں۔خوراک،لباس،موسیقی،کھیڈ،جزبات وغیرہ کجھاں چیزاں پر تہزیب کو تعین ہوئے۔

لباس: گوجر قوم کا لوک ہر رنگ تے ہر قسم کو لباس لاویں۔پرانا زمانہ ما کجھ مرد دھوتی وغیرہ بھی لاویں تھا۔گوجر لوک اکثر شلوار کمیز تے اپر لنگی (صافہ) گوجر قوم کی خاص پہچان ہے۔اج جدید دور ما مغربی اثرات توں دوچار ہو کے ہن پنٹ،کمیز وغیرہ کو رواج نوجواناں ما عام ہو گیو ہے۔لیکن بزرگ لوک تے دور دراز دیہات مار ہن آلا لوک اجاں بھی شلوار کمیز ہی لاویں۔عورت رنگین لباس لا نو زیادہ پسند کریں۔پرانا زمانہ ما عورت کھلی ڈھلی شلوار قمیض،سر پر پشم کا دھاگہ کی تے سوئی نال بنی بھی ٹوپی،نک مالونگ (کوکو)،گلا ما چاندی کو ہار جس نا 'دلڑو' کہیو جائے تے چاندی کی گانی لاویں تھیں۔لیکن اج کا دور ما دور دراز گراں ماتے اجاں بھی وہ ہی رواج سلوار،قمیض کو چلے پر کجھاں علاقاں مانکی عمر کی کڑی ہن پلازو،شرارہ،وغیرہ لان کو رواج چل گیو ہے۔لیکن گوجری ثقافت کی اصل پہچان وہ ہی پرانو لباس ہے جس نا دور دراز گراں کا لوکاں نے اس دور ما بھی سنمبھال کے رکھیو وہ ہے۔سرخی نال ہونٹ لال کرن کے بجائے اخروٹ کو چھلکو استعمال کریں۔پرانا زمانہ ما جس ویلے برف وغیرہ پوے ہوئے تے لوک زیادہ پرال کی بنی بھی پول کو استعمال کریں ہوئیں۔یوہ رواج ہن موجودہ دور ما گھٹ ہو گیو ہے۔اس طرح رسوئی واسطے بھی اسے پرال کی بنی بھی پھوڑی کو استعمال کریں ہوئیں۔اس تو علاوہ ویہہ بھیڑ کی اون نا کات کے لوئی،پٹو بنا کے کمبل کو استعمال کریں۔

کھیڈ: گوجر قوم کا بچہ تے نوجوان ہر طرح کی کھیڈ کھیڈیں۔مثال کا طور پر چھپن چھپائی،گلی ڈنڈو (جس نا ویہ اٹی ڈنڈو کنیں)،رسا کشی،بینی پکڑنی،کبڈی،بغدر چانو (ایک بڑو پتھر چانو کسے بھی موقع پر)،نشانہ بازی،کشتی،وغیرہ۔اج کرکٹ وغیرہ جیسی کھیڈ بھی کھیڈی جائیں۔

خوراک: گوجر لوک خوراک کا معاملہ ما خود کفیل ہیں۔ددھ،مکھن،لسی انھاں نا گھراں ما دستیاب ہوئے۔گوجر لوکاں کی عام خوراک مک کی روٹی،سرسوں کو ساگ،لسی،ددھ،مکھن،کلاڑی (ددھ تے

لسی کی بنی بھی روٹی) وغیرہ ہے۔ یہ لوک اپنا مال مویشی کا دودھ کا کئی ذائقہ دار پکوان بنالئیں۔ اس توں علاوہ گھنڈور کوساگ، بتھوو، کونجی وغیرہ دیسی سبزی عام طور پر پکائی جائیں۔ لسی کی بنی بھی کڑان کی سبزی زیادہ مشہور ہے۔ بیاہ شادیاں کا موقع پر گوشت وغیرہ کو استعمال ہوئے۔ اج کو دور ما وقت بدلن کے نال نال ہن کئی قسم کا پکوان گوجر قوم کا لوکاں ما بھی عام ہو گیا ہیں۔ لیکن یہ کجھ بنیادی چیز گوجر کلچر کو حصو ہیں جہڑی کہ انھاں نا دوجی قوماں نالوں بکھ کریں۔ جس طرح عام چاہ کی جگہ مسلون کی چاہ، کٹھ، کوڑ، پتریس، میدر سک، گگل تے اور بھی کئی دیسی چیزاں کو حلوہ وغیرہ۔ یہ لوک عام طور پر سلور، سٹیل، کچ کا بھانڈاں کے بجائے مٹی تے ترامہ کا برتن زیادہ استعمال کریں۔

مکانیت: گوجر قوم کا لوکاں کی زیادہ اکثریت پہاڑی علاقاں ما آباد ہیں۔ گوجر لوک اس را کا کوٹھاں ما رہنوز یادہ پسند کریں جنھاں ما ٹھنڈ تے گرمی دواں نال ٹپن کو بندوبست ہوئے۔ پہلاں پہلاں کچا مٹی کا بنیا بھی ڈھاراں ما یہ لوک رہیں ہوئیں۔ انھاں لوکاں کا مکان کچی مٹی تے پتھر نال بنایا جائیں۔ تے چھت اپر دیودار، تنگ، تے چیڑ کا درختاں کی لکڑیاں کو استعمال کیو جائے جس نا کڑی کہیو جائے۔ جس نال یہ مکان کافی مضبوط ہو جائیں تے سیال کا موسم ما برف پین کے باوجود بھی انھاں نا کوئے اثر نہیں ہوتو۔ کوٹھاں کا عام طور پر ترے حصہ کیا جائیں۔ اج کا دور ما کجھاں جہگاں ماپکا کوٹھا بھی بن گیا ہیں۔ لیکن دور دراز گراں ما لوک اجاں بھی کچا ہی کوٹھاں ما وقت ٹپاویں۔

موسیقی: گوجر لوک اکثر سیف الملوک، گوجری بیت وغیرہ سنو پسند کریں۔ بنجلی، الگوجو، سارنگی وغیرہ موسیقی کا آلات ہیں۔ بنجلی ما لوک گیت گایا جائیں۔ انھاں ما بالو، ماہیا، قینچی، ککو، شوپا ہیا تے اور بھی کئی گیت شامل ہیں۔ یہ لوک اکثر بر ہیا کی رت ما ڈھوکیں جانو تے نال ہی نال گوجری گیت، شوپائی یا تے آپے گانا یا پھر ریڈو ما ریکارڈ کیا بھی انھاں نا ذہنی سکون دین واسطے اہم جز ہوئیں۔

شادی بیاہ: گوجر قبائل بیاہ توں پہلاں منگنی (کڑمائی) کی رسم کریں۔ اس تو کجھ وقت بعد بیاہ کو دھیاڑو مقرر کیو جائے۔ بیاہ ما کڑی جڑ کے گیت بھی گاویں تے اور بھی بہت ساری رسم کریں۔ انھاں لوکاں کا بیاہ شادی، میلا ٹھیلا ہر ایک چیز ما اپنو بکھ انداز ہوئے۔ گوجر قبیلہ کا لوک بیاہ شادی کی رسومات کافی سنجیدگی نال نبھاویں۔ دوجی مزہبی رسومات توں انھاں کی رسم کافی مختلف ہیں۔ اپنی ہی قوم ما رشتہ لین، دین کریں۔ غیر قوم ما رشتہ داری کرنو عیب سمجھیں۔ رشتہ تہہ کرن ما والدین کی رضا مندی نا کافی ترجی دتی جائے۔ بیاہ آلے تیہاڑے عورتاں نے جڑ کے گھڑولی جہڑی کے اپروں رتا پشم کا دھاگہ نال بن کے سجائی بھی ہوئے تر بہن کا سر پر رکھ کے نال اور بھی مچ ساری عورت جڑ کے گیت گانا انھاں کی

ثقافت کو حصو ہیں۔

ناں: گوجر قبیلہ کا لوک جہڑا اسلام مزہب نال تعلق رکھیں اکثر اپنا بچاں کا ناں پیغمبراں تے انمبیاء※ کا ناں پر رکھیں۔محمد، احمد، یوسف، اسمائیل، ابراہیم، یعقوب، داؤد وغیرہ ناں مشہور ہیں۔اس راعورتاں کا ناں ما فاطمہ، حلیمہ، عائشہ، رقیہ، کلثوم وغیرہ ناں مشہور ہیں۔

مہمان نوازی: گوجر قبیلہ کا لوک بڑا مہمان نواز ہیں۔اگر کوئے بھی مہمان انھاں کے گھر آوے تے اسکی چنگی طرح مہمان نوازی کریں۔انھاں واسطے اخروٹ، بادام، خوبانی یعنی بالائی علاقہ کا ہر قسم کا میوہ پیش کریں۔ددھ، مکھن، لسی، گھی وغیرہ بھی پیش کریں۔رخصتی کے وقت مہمان ؟ کے نال کجھ قدم چل کے بھی جائیں۔یہ لوک اکثر ایک دوجا کے گھر آنو جانو پسند کریں۔

اخلاق تے عادات: حقیقی معناں ماتکیو جائے تے کسے بھی انسان کا اخلاق تے عادات ما زیادہ فرق نئیں ہوتو۔البتہ کجھ ایسی عادات بھی ہوئیں جہڑی کسے قوم کی مخصوص ہوئیں۔اس بارے گوجری کی ایک کتاب شاہان گوجر 'ما اس رالکھیو وہ ہے۔ " کدے حقیقت ما دیکھیو جائے تے ہم کسے قوم کا اخلاق کے بارے حتمی کائے رائے نہیں متھ سکتا کیوں جے اخلاق تے عادت پکی نہیں ہوتیں بلکہ بدلتی رہیں۔اک قوم ایکن وقت ما جرائم پیشہ ہووے تے دوجا وقت ما بہتر ہو جائے تے اسو ہی اس کے الٹ حالت دسیں۔بنی نوع انسان کی فطرت بھاویں ویہ کسے قوم توں ہونویں اک جسی ہووے "

(مھار وادب، جلد 26 (شاہان گوجر نمبر) گوجری ترجمو، ع 2018، ص 130۔31۔)

گوجر قوم نے جس طرح تاریخ توں پتو چلے کو ہندستان ما کئی سال حکومت بھی کی۔یاہ اس قوم کی بہادری کی دلیل ہے۔گوجر قوم کے اندر خب الوطنی کو جزبو تے امن پسندی پائی جائے۔

زمینداری: کجھاں کتاباں توں پتو چلے کہ گوجر پرانا زمانہ تو ہی زمینداری آلے پاسے بھی دھیان رکھتا رہیا ہیں۔شاہان گوجر 'ما اس بارے اسر الکھیو گیو ہے: " گوجر پرانا زمانہ ما حکومت کرن کے سنگو سنگ زمینداری آلی بکھی بھی خاص دھیان رکھتا رہیا ہیں۔جہڑا جہڑ اجتھا آیا ویہ اپنا راجاں کی فوج ماں جنگی ہتھیار رکھیں تھا۔ویہ اپنے ہتھیں زمینداری بھی کریں تھا۔ویہ جنگ کی بہادری تے زمینداری دوہاں ما مشہور تھا" (مھار وادب، جلد 26 (شاہان گوجر نمبر)، گوجری ترجمو، ع 2018، ص 168۔)

انھاں ستراں توں یوہ ظاہر ہوئے کہ گوجر کافی پہلاں توں ہی زمیندراری کو شوق بھی رکھیں تھا۔اج گوجر قوم کو ایک گروہ جس نا بکروال کہیو جائے ویہ لوک زیادہ تر مال مویشی لے کے ہجرت کرتا رہیں۔انھاں لوکاں کو کوئے ایک ٹھکانو نہیں ہوتو۔اس کے برعکس جہڑا عام گوجر لوک ہیں ویہ زمینداری

کر کے اپنا مال مویشی کو چارو بھی کریں تے اپنو گزارو بھی کریں۔کھیتی باڑی کرنو بھی انھاں کی تہذیب کو حصو ہے۔بقول سروری کسانہ: " گوجر فطری طور پر بہادر،غیور اور آزاد طبیعت ہوتے ہیں۔اور ان کی روایات میں وطن اور سیکولر پروری،مہمان نوازی،پیر پرستی اور بھینسوں کے ساتھ پیار ایسی باتیں ہیں جو ان کے خون میں رچی بسی ہوئی ہیں"(سروری کسانہ،قدآور۔۔زندگی تے کم(فتح علی سروری کسانہ)،ع2017،ص346۔)

ہندستاں ما گوجر کافی تعداد ما آباد ہیں۔جنھاں کو مسلمان،ہندو،سکھ تروا ں مزہباں نال تعلق ہے۔ہندستان کی کئی ریاستاں ما گوجر خاصی تعداد ما آباد ہیں۔جس رار اجستھان،گجرات،مدھیا پردیش،ہماچل پردیش،پنجاب،جموں کشمیر وغیرہ۔اگر ہم خاص طور پر جموں کشمیر کی گل کراں تے جموں کشمیر ما مسلمان گوجر ہی آباد ہیں۔جموں کشمیر ما دو جی قوماں کا مقابلہ ما اکثر گوجر زیادہ پیر پرست ہیں۔اس کی کئی اور وجوہات بھی ہوسکیں۔لیکن بقول سروری کسانہ:

"مسلمان گوجروں خصوصاً جموں کشمیر کے گوجروں میں پیر یعنی خدا پرست سید اور صوفی بزرگوں کی تعظیم اور ان کے مزارات کے ساتھ عقیدت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے بزرگ اس طرح کے اولیاء اللہ کی تبلیغ سے اسلام میں آئے تھے اس وجہ سے ان پر صوفی ازم کا اثر غالب ہے"(ص 347۔)

لباس،رہن سہن اور خوراک کا لحاظ نال گوجر سب توں سادگی پسند طبقو ہے۔گوجر مرداں کو قدیم لباس وہ ہی ہے جہڑو اس ویلے بھی راجستھان ما پائیو جائے۔جس طرح سر پر بڑی پگڑی،کرتا کے ہیٹھ دھوتی وغیرہ۔زیادہ تر یہ لوک کھلی جھگاں مار ہنو پسند کریں جت انھاں کا مال مویشی واسطے بھی چارہ کو ذریعو ہوئے۔عورتاں کا لباس ما گھاگھرو اس کے اپر تنگ کمیز تے لمبو گھونگٹ لیکن راجستھان توں باہر یوہ لباس نہیں لائیو جاتو۔جہڑا گوجر مسلمان ہو گیا ان کا لباس مانوی سوچ کے مطابق تبدیلی آ گئی۔جس جس علاقہ ما یہ لوک گیا تے ات کا لوکاں کا اثرات ان ما بھی آ گیا۔مثال کا طور پر جس طرح جموں کا گوجر کمیز کے نال تہمت تے سر پر پگڑی بنیں۔یوہ لباس پنجاب کو بھی ہے۔یوہ انھاں پر پنجابی تہذیب کو اثر نظر آوے۔اس توں علاوہ کشمیر کا گوجر مرد زیادہ ٹوپی لاویں یوہ انھاں پر کشمیری تہذیب کو اثر ہے۔پونچھ راجوری کا گوجراں کی طہرہ دار پگڑی پوٹھوہاری لبے۔اس توں علاوہ اور بھی انھاں پر کئی تہذیباں کا اثرات نظر آویں۔کیوں جے جس ویلے ہندستان ما گوجراں کی حکومت کو زوال شروع ہوؤ تے یہ لوک نس کے دور دراز مختلف علاقاں ما بس گیا تے انھاں ہی تہذیباں کا کئی اثرات بھی قبول کر لیا۔

Afsane افسانے

Woh Zulekha by Vehshi Syed (Srinagar) cell-9419012800

وحشی سعید (سرینگر)

وہ زلیخا

جب میں اپنا کٹا ہوا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر لال چوک میں کھڑا ہوا تو لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ لوگ یہ منظر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''یہ ہماری سوچ ہے یا حقیقت''

میں بھی پریشان تھا کہ مجھے اپنا سر دھڑ سے کیوں الگ کرنا پڑا۔

میں کوئی یوسف تو نہیں لیکن کسی سے کم بھی نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کر خوبصورت لڑکیاں خواب میں اپنی انگلیاں ضرور کاٹ کھاتی تھیں۔ راستوں پر ترچھی یا چوری کی نظر سے مجھے ایک بار گھور کے دیکھتی ضرور تھیں۔ یقیناً میں بھی حسن کی تاریخ کے سلسلے میں اپنی ایک تاریخ منسلک کر رہا تھا۔ وہ بھی کوئی زلیخا نہیں تھی لیکن زلیخا سے کم بھی نہیں تھی۔ بے پناہ حسن کی ملکہ، ایسا حسن ادراک کی حدوں کو پار کر دیتا ہے۔ نہ میں اس کا عاشق تھا اور نہ وہ میری محبوبہ۔ پھر بھی کیا کشش تھی کہ ہم ایک دوسرے کی جانب کھنچتے جا رہے تھے۔ لیکن بہت قریب ہو کر بھی ایک دوسری کے قریب نہ تھے۔

اسی طرح ہم ایک دوسرے کی کشش اور دلچسپیوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ کچھ دنوں کے لیے ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔ مجھے دوسرے شہر کی رنگینیوں میں کھو جانا پڑا جہاں یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ دن کب غروب ہوا اور رات کب ختم ہوئی۔

اس شہر میں ایک حسینہ کی اداؤں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ محسوس ہی نہ ہوا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ وہ میرے اوسان پر اس قدر حاوی تھی کہ پیتل کی چیز بھی اگر وہ سونا کہے تو مجھے سونا لگتی تھی۔ اس قدر مدہوشی کے عالم میں میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ساری دنیا میری دشمن ہو گئی لیکن میں اپنے ارادے اور اپنے وعدے سے پیچھے نہیں ہٹا۔

اس کٹھن سفر میں ایسا پڑاؤ بھی آیا جب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جس کے بطن سے پیدا ہوا

اس کو چھوڑ دوں یا مدہوشی کے سرور میں ڈوبا رہوں۔ میں نے اس سے کہا۔

''اتنا بھی نہ کھینچ کہ میں ٹوٹ جاؤں۔''

اور میں ٹوٹ گیا۔

اس رات بہت تیز بارش ہوئی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس رات سارا شہر ڈوب گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ مایوس۔۔۔۔۔۔ بے بس۔۔۔۔۔۔ تارے گننے کے لیے لیکن اس رات تارے بھی نہ نکلے۔

مایوسی کا یہ عالم بہت دنوں تک رہا۔ بہت دنوں بعد میں اپنے شہر واپس لوٹا۔ یہاں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہر جانب ہریالی تھی۔ مجھے میرے شہر نے گلے لگایا۔ یوں لگا صدیوں بعد اس جنت میں واپس آیا ہوں۔

زلیخا وہیں تھی جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔

وہ آج بھی انچھوئے حسن کی شہزادی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''کیا ملا تمہیں اجنبی شہر کی خاک چھان کر۔''

مجھے یوں لگا جیسے مجھ سے کہہ رہی ہو۔

''یوسف، زلیخا صرف یوسف کے لیے بنی ہے اور یوسف زلیخا کے لیے۔''

اس سوچ نے مجھے مایوسی کی دنیا سے نکال کر ایک بار پھر محبت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ میں زلیخا کے قریب ہوتا گیا اور اپنی دنیا سجانے لگا۔ مجھ سے کہا گیا۔

تمہارا نکاح زلیخا کے ساتھ ہوگا۔

میں نے بے چوں چراں کے حامی بھر دی اور دل ہی دل میں خوشی سے اچھلنے لگا۔

جب زلیخا دلہن کے لباس میں حجلۂ عروسی میں داخل ہوئی، میں بول پڑا۔

''مجھے میری دنیا مل گئی۔''

زلیخا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''کیا ہوا زلیخا۔۔۔۔۔ تم خوش نہیں۔''

وہ کمرے کے ایک کونے میں دبک گئی۔ سارا ماحول ماتمی ہو گیا۔

میں ٹوٹ کے بکھر گیا۔ لیکن اب۔۔۔۔۔۔۔!

بہت دنوں تک میں سوچتا رہا۔ ڈوبتا رہا۔۔۔۔۔ ابھرتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا

کروں۔ جب عقل جواب دے گئی تو میں زلیخا کے پاس گیا۔

''زلیخا بول۔۔۔۔۔۔۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''یوسف تم میرے عزیز ہو۔ لیکن جس رشتے میں ہم بندھ گئے، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ سب کیسے ہوا، کیوں ہوا۔۔۔۔۔ میں کچھ نہ سمجھ سکی۔''

''لال چوک میں جمع لوگوں کا ہجوم کیا اب بھی مجھ سے یہ سوال کرے گا کہ میں نے اپنا سر اپنے دھڑ سے کیوں الگ کیا۔''

☆☆☆

Bhangi by Vehshi Syed (Srinagar) cell- 9419012800
وحشی سعید (سرینگر)

بھنگی

بھنگی کا لفظ جب زبان پر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہونٹوں تک ایک گالی چلی آئی ہے۔ اگر میں نے اردو زبان کی لغات کو مرتب کیا ہوتا تو اس لفظ کو کبھی شامل نہ کرتا۔ لفظ کبھی برے نہیں ہوتے۔ دراصل یہ انسانی ذہن ہے جو لفظوں کو برا بناتا ہے۔ اور ان کو ایک ایسے ماحول کے سپرد کر دیتا ہے جہاں لفظوں کی اصلیت پر گندا لحاف چڑھ جاتا ہے۔ جب بھی میں لال چوک کی سڑک سے ٹانگے پر سوار گھر کی طرف جاتا تو کسی نہ کسی بھنگی کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھتا۔ ایسے لمحات پر اکثر آدمیوں کے منھ لٹک جاتے۔ تب میرا دل چیخنے لگتا اور میں خود سے کہتا۔

''اٹھو اور لفظوں کا گندہ لحاف اتار کر پھینک دو۔''

لیکن میرا یہ جذبہ تھوڑی دیر میں ٹھنڈا پڑ جاتا اور میں ایک بار پھر گھوڑے کی رفتار میں کھو جاتا۔ میں غور سے گھوڑے کی رفتار کو دیکھتا۔ آہستہ آہستہ اس کی اس رفتار میں ایک چہرہ نمودار ہوتا۔۔۔۔۔۔ جانا پہچانا چہرہ۔۔۔۔۔ ایک بھنگی کا چہرہ۔

وہ شروع سے آخر تک بھنگی تھا۔ صمد۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ صمد بھنگی۔۔۔۔۔ صمد بھنگی سے سرینگر کے ہر گلی کوچے واقف تھے۔ ہر سڑک کی اس نے گندگی اٹھائی تھی۔ گندے اور صاف کوچے اور گلیاں صمد کو نہیں بھول سکتے۔ ایسا کون تھا جو صمد کو نہیں جانتا تھا۔ اس کا پتہ ہی ایسا تھا۔ وہ شرافت کا ایک پیکر مجسم تھا۔۔۔۔۔ وہ انسان تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ ایک بھنگی تھا۔ اس لیے کبھی کسی نے اس کے انسان ہونے کا ذکر نہیں کیا۔

ہر آدمی کی کوئی نہ کوئی خواہش ہوتی ہے۔ صمد کی یہ خواہش تھی کہ اس کے گھر ایک اولاد پیدا ہو۔ اس نے خانقاہوں کی کھڑکیوں پر کپڑے باندھے۔ لیکن سب بے سود۔ وہ قدرت سے مایوس تھا۔ اس لیے اداس رہتا تھا۔

ایک دن وہ مجھے غیر معمولی طور پر خوش نظر آیا۔

''کیوں صمد کیا بات ہے آج تم خوشی سے پھولے نہیں سما رہے۔''

''حضور مجھ پر خدا مہربان ہوا۔ میرے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا۔ میں حضور باپ بن گیا ہوں۔''

میں نے اس کے مسرت سے بھرپور چہرے کو دیکھا۔ پھر سنجیدہ آواز میں کہا ''صمد کیا اس کو بھی بھنگی بناؤ گے۔''

وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

''نہیں! بابو وہ بھنگی نہیں بنے گا۔ وہ آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میں اس کو خوب پڑھاؤں گا۔''

مجھے خوشی ہوئی کہ آج ایک بھنگی کچھ اور بول رہا تھا۔ جس کو سماج صرف اندھیرے غاروں میں دیکھتا تھا۔

وقت کا دھارا بہتا رہا اور چھ سال یوں چلے گئے۔ جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔ میں اپنے بیٹے کو اسی محلے کے ایک اسکول میں داخل کرانے گیا۔ جہاں صمد کا بیٹا پڑھ رہا تھا۔

''صمد کا لڑکا کس جماعت میں پڑھ رہا ہے۔''

''کس صمد کا لڑکا۔''

''صمد بھنگی کا لڑکا۔''

''حضور بھنگی کا لڑکا صرف بھنگی ہی بن سکتا ہے۔ ایک سال پڑھا اور چھوڑ دیا۔''

استاد سے یہ بات سن کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بھنگی کا لڑکا مر گیا۔

پھر بہت دنوں بعد مجھے صمد ملا۔ وہ بوڑھا ہو چلا تھا اس کے ہاتھ میں وہی پرانا جھاڑو تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''صمد تمہارا لڑکا زندہ ہے؟''

''زندہ ضرور ہے لیکن بابو میں اس کو وہ نہیں بنا سکا جو بنانا چاہا۔''

مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ جس کی کشتی کو بادمخالف نے الٹ کے رکھ دیا تھا۔ ایک دن میں نے اس کو اور اس کے چھوٹے بیٹے کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھا۔ میں چاہتا تھا کہ صمد کے بوڑھے بازوؤں میں ایک بار پھر وہ قوت بھر دوں جو اس کو سماج سے بغاوت کرنا سکھا دے۔

وقت کس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے کسی کو یہ سب جاننے کے لیے فرصت نہیں ہوتی۔ سب اپنی دھن میں کھوئے رہتے ہیں۔ وہ اور اس کا بیٹا سڑکوں کو صاف کرتے رہے۔ موٹر بسیں، ٹانگے۔ سبھی سڑکوں پر چلتے رہے اور اس کے ساتھ باپ بیٹے کا جھاڑو بھی سڑکوں پر چلتا رہا۔

پھر۔۔۔۔۔۔۔ پھر ایک دن۔۔۔۔۔۔ صمد کا بیٹا لال چوک کی سڑک صاف کرتے ہوئے ایک موٹر کی زد میں آ گیا۔ معصوم بچے کا خون سڑک پر پھیل گیا۔ صمد بت کی طرح کھڑا رہا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

''میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو وہ بننا چاہتا تھا اس لیے خدا نے اس کو واپس بلا لیا۔''

دوسرے دن میں نے صمد کو سڑک پر اپنے ہی بیٹے کے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے دیکھا۔۔۔۔۔۔ کیونکہ۔۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔۔ بھنگی تھا۔

☆☆☆

Tab Dopahar thi by Noor Shah (Srinagar) cell-9906771363
نورشاہ (سرینگر)

تب دوپہر تھی

یادیں کبھی خوبصورت اور کبھی بدصورت رُخ اپنا کر جب ترتیب پاتی ہیں تو دل کی جن دھڑکنوں پر زندگی کی امیدیں قائم ہوتی ہیں وہی روگ بن جاتی ہیں روح کا تعلق براہ راست دل سے ہے، روح مرگئی، دھڑکنیں رُک گئیں، دل بجھ گیا دل بجھ گیا اور ابدی اندھیروں میں کھو گیا..... اگر میں ایک سنگ تراش ہوتا تو اپنی زندگی کے ابدی اندھیروں میں اُس پتھر کی تلاش کرتا جس نے کچھ خوبصورت اور کچھ بدصورت یادوں کو ترتیب دے کر مجھ سے میرا ماضی چھین لیا۔ ماضی اور روح دونوں ایک دوسرے کے متلاشی ہیں دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کے متمنی ہیں۔ پر اب ان کی تکمیل کیسے ہوگی۔ ان کا ملاپ کیسے ہوگا!!

کہتے ہیں کہ خودکشی بزدلی ہے کہتے ہیں خودکشی بہادری ہے، کون سچا ہے اور کون جھوٹا میں بزدلی کی اس داستان میں الجھنا نہیں چاہتا۔ میں تو اس لمحے کو ایک بار پھر اپنی نظروں کے سامنے دہرانا چاہتا ہوں جب میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ فرار کا راستہ اپنانے کی بات کی تھی۔ رات اُتر رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔

تم چلے گئے
تب دوپہر تھی

اور میں نے دیکھا ایک طویل کمرہ تھا، سنگ مرمر کا سنگ مرمر کے بت تھے، سنگ مرمر کی مورتیاں تھیں، تصویریں تھیں اور سنگ مرمر جیسا سفید اور بے داغ چہرہ تھا۔

زلیخا نے کہا ''جانتے ہو پھر کیا ہوا؟

میں نے نفی میں گردن ہلا دی

'' کہتے ہیں یوسف زلیخا کے سنگ مرمر کے اس ماحول سے بھاگ گیا''

''کیوں''، میں نے پوچھا

''کہتے ہیں زلیخا یوسف سے عمر میں بڑی تھی۔''

''عمروں کی تفاوت میں کیا رکھا ہے، ہاں ہاں کیا رکھا ہے، مجھے ہی دیکھ لو۔ میرے ارمان میری اُمنگیں بالکل اسی طرح پروان چڑھ رہی ہیں جس طرح ایک تاریک رات جشنِ سحر گاہی منانے کے لئے تگ و دو کرتی ہے، میں اپنے دل کے جوالا مکھی کو کب تک سینے کی گہرائیوں میں دبا رکھوں گا..... میرا نام یوسف نہیں، میں یوسف کی طرح خوبصورت بھی نہیں..... پر..... پر میں.....!''

''ہاں ہاں کہو..... کہو نا؟

''میں ایک عورت سے عشق کرتا ہوں جس کی عمر پچاس سال کی ہے جو مجھ سے بیس سال بڑی ہے اور جس کا نام ہے زلیخا۔

''زلیخا''؟

''ہاں زلیخا..... جس کی آنکھوں میں سحر انگیز تتلیاں جیسے جگمگاتے ستارے بکھیر رہی ہوں، جب وہ ہنستی ہے تو لگتا ہے جیسے پھولوں کا جگر کٹ رہا ہوں جب وہ انگڑائی لیتی ہے اور میری طرف دیکھتی ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے سنگ مرمر سے بنید ینسکی مورتی گلاب کے پھولوں کا سہارا لے کر ہم سے لپٹنا چاہتی ہے۔ رنگ رنگ کے لباس میں پوشیدہ اس کا سمٹا سا بھیگا بھیگا سا بدن، اس کی سانسوں کی خوشبو سے عمر خیام کی رباعیوں جیسی مہک.....!''

''کون ہے وہ..... اس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا

''کہہ تو چکا ہوں کہ وہ زلیخا ہے''

''واقعی''

''ہاں..... یہ ایک حقیقت ہے''

وہ شرمائی۔ اس کا سر جھکا گیا..... میں جانے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو''

''زلیخا کی تلاش میں''

''کہاں ہے تمہاری زلیخا''

''آئینے میں اپنی صورت دیکھ لیجئے تو شاید نظر آئے۔''

میں ابھی ابھی گھر لوٹا ہوں، اپنے کمرے کی کھڑکی کے قریب بیٹھا سامنے والے مکان کی طرف دیکھ رہا ہوں جہاں اب زیب رہتی ہے اور جہاں کبھی سُرخ بالوں اور نیلی آنکھوں والی زیتون رہا کرتی تھی۔

زیتون کی شادی ہو چکی ہے، اس کھڑکی سے زیتون کو میں نے آخری بار اُس وقت دیکھا تھا جو وہ سرخ جوڑا پہنے اپنے نئے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب آئی۔

''الوداع میں جا رہی ہوں''

''الوداع''

اور اس رات زیتون ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلی گئی اور اب یہاں زیب رہتی ہے زیب زیتون کی چھوٹی بہن ہے۔

''زیب؟!''

زیب مجھ سے دس برس چھوٹی ہے لیکن عمروں کی تفاوت میں کیا رکھا ہے، پر میں کس قدر کمینہ ہوں، میرا چھوٹا بھائی جو زیب کا ہم عمر ہے، دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں، پہچانتے ہیں پھر بھی میں رات کی خاموشیوں میں وقت بے وقت زیب کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں

میرے چھوٹے بھائی!

تم نہیں جانتے کہ ایک دن زیب بھی اپنی بہن زیتون کی طرح سُرخ جوڑا پہنے اسی کھڑکی سے سلام کر کے ہمیشہ کے لئے کسی اور کو اپنائے گی اور شاید تمھیں بھی میری ہی طرح کسی پچاس سالہ زلیخا سے عشق کرنا پڑے گا۔

بات خودکشی کی ہے اور وہ لمحہ گذر چکا ہے جب میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لمحے کی یادیں ترتیب پا چکی ہیں لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے..... ''میں بہ ہوش وحواس تحریر کرتا ہوں کہ میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے''..... لیکن میری انگلیوں میں دبا قلم کیوں کانپ رہا ہے۔ اب تو صرف دستخط کرنے رہ گئے ہیں، دستخط ہوتے ہی اس تحریر میں جان آئے گی، ورنہ میری یہ تحریر بے جان ہے بے رنگ ہے!

رات کافی اُتر آئی ہے اور میں سونا چاہتا ہوں، اپنے ماضی کی یادوں کو ایک خواب کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں مگر نیند کس کے بس میں ہے۔

تم چلے گئے!

تب دوپہر تھی!!

ہاں شاید وہ دوپہر ہی تھی جب میں ایک اجنبی بن کر زلیخا کی بستی میں چلا آیا تھا لیکن مجھے اندھیروں نے ڈس لیا۔ جو ڈھونڈتا ہے وہ کھو جاتا ہے۔ میں نے زلیخا کو ڈھونڈا اور اپنے آپ کو کھو دیا۔ کھویا ہوا آدمی

ہمیشہ تنہا ہوتا ہے۔تنہائی جرم ہے اور اس جرم کی سزا بھی تنہائی ہی ہے!

یہ دل اسٹیج ہے جس پر نئے پرانے کردار آتے ہیں اور نئے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ایک ڈرامہ میں بھی کھیل رہا ہوں، اس کھیل کا مصنف میں ہوں، ہیرو میں ہوں، ویلن بھی میں ہی ہوں لیکن ہیروئن زلیخا ہے جو مجھ سے بیس سال بڑی ہے جس کی ایک بیٹی ہے شاید میری ہم عمر اور جب میں اُن کے گھر کے سٹیج پر نمودار ہوتا ہوں وہ پڑھنے کے بہانے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے، پڑھنا لکھنا تو ایک بہانہ ہے وہ اکرم کو خط لکھتی ہے۔سکون سے پیار بھرا خط لکھنے کا اس سے بڑھ کر کون سا وقت نصیب ہوسکتا ہے، یہ اکرم بھی عجیب سا لڑکا ہے، میں نے ہمیشہ اُسے ہنستے مسکراتے دیکھا ہے۔ وہ ہنستے مسکراتے زلیخا کی بیٹی کا خط مجھے سناتا ہے۔

میرے پیارے اکرم!

میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی!!

بس وہی فرسودہ باتیں۔اب شمہ کو کون سمجھائے کہ تمہاری ممی تمہارے پاپا کے بغیر گذر بسر کرتی ہے۔ تمہارا پاپا صبح دس بجے چلا جاتا ہے، رات کو دس بجے گھر لوٹ آتا ہے۔ یہ اس کا معمول ہے، اپنے کاروبار کے سلسلے میں کافی مصروف رہتا ہے، بارہ گھنٹے کے اس طویل عرصہ میں کیا کچھ نہیں ہوتا، بارہ گھنٹے کی طوالت میں لمحوں کی کوئی قیمت نہیں، ان لمحوں میں کتنے اور لمحے جنم لیتے ہیں، کتنے گناہ اور کتنے ثواب وجود میں آتے ہیں، یہ ایک طویل کہانی ہے اور میں اس طویل کہانی کا کردار نہیں بننا چاہتا، کہانیوں کا بھی کیا ہے کل کی حقیقت آنے کی کہانی کا روپ اپنا لیتی ہے۔

اگر میرے پاس ایک کوٹھی ہوتی، ایک گھر ہوتا اور اُس گھر کے گلابی رنگ کی خواب گاہ میں ایک آتش کدہ ہوتا تو میں اپنی ساری یادوں کو جلا دیتا۔

''تم کیا لوگے..... کافی، چائے یا کچھ اور.....!'' میرا ہنستا مسکراتا، انجینئر دوست اکرم مجھ سے پوچھتا ہے۔

میں اس کی جانب دیکھتا ہوں۔

''مگر''

''مگر کیا''

''شمسہ کا میرے نام آیا ہوا خط.....!!''

''وہی پرانی کہانی، دہرانی ہوگی .....'' میں اکرم کی بات کاٹتے ہوئے کہتا ہوں.....''

میرے اکرم میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

اور اکرم اپنا خط سنائے بغیر ہی ہوٹل سے باہر چلا جاتا ہے!

میں نے کنول کے روپ میں اپنی محبوبہ کو دیکھا، یہ خبر ساری جھیل میں پھیل گئی۔ اور پانی میں اس کے اشتہار لگ گئے اور پھر ایسا ہوا کہ جھیل کی لہروں میں ارتعاش سا پیدا ہو۔

''کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''تو کیا ہوگا''

''اشتہار لگ جائیں گے''

''کہاں''

''پانی میں''

زلیخا نے جھیل میں جھانکا وہاں کچھ بھی نہ تھا، ایک ڈرا ڈرا سا جھکا جھکا سا شفق کی لالی میں ڈوبا ہوا ایک چہرہ..... زلیخا کا اپنا چہرہ!

''کل حامد صاحب تمہارے بارے میں کہہ رہے تھے''

''کیا''

''ایک عجیب سی بات، میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو مادام زلیخا''

''میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتی، حامد صاحب کہنا چاہتے ہیں..... اُنہیں تمہارا اور شمسہ کا رشتہ پسند ہے''

''شمسہ اور میرا رشتہ؟!''

میں نے پتھر پر ایک نقش بنایا۔ وہ نقش مٹ گیا اور پھر وہی پتھر ابدی اندھیروں میں کھو گیا۔ اگر میں ایک سنگ تراش ہوتا تو ابدی اندھیروں میں اُسے تلاش کرتا۔

''اکرم کا کیا ہوگا''

''کون اکرم؟''

''میرا ہنستا مسکراتا انجینئر دوست جو شمسہ سے بے حد محبت کرتا ہے۔

''یہ غلط ہے''

''یہ ایک حقیقت ہے''

''اگر یہ حقیقت ہے تو اس حقیقت کو ماضی کی بھولی بسری یاد کا روپ دے کر زندگی سے الگ بھی کہا جا سکتا ہے اور پھر.....!''

''پھر کیا: میں نے پوچھا۔

''تمہارے ہاں کرنے سے..... میرا مطلب ہے کہ میری بیٹی شمسہ کو اپنا کر مجھے بھی میری منزل مل سکتی ہے اور پھر ہمیں ایک دوسرے کے قریب رہنے میں کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا، کوئی ہم پر شک بھی نہیں کر سکتا۔ کوئی ہماری جانب آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہ کر سکے گا''۔

''اور پانی میں اشتہار لگ جانے کا خطرہ بھی ٹل جائے گا''

''ہاں''

زیست میں کوئی تازگی نہیں، زیست ایک اُلجھن ہے شاید اسی لئے میں حامد صاحب اور زلیخا کی اکلوتی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا اور شاید ایسی اُلجھن کی وجہ سے میں پچاس سالہ زلیخا سے عشق کرتا ہوں لیکن اب میری یادیں ترتیب پا چکی ہیں۔ دل کی دھڑکنیں روگ بن چکی ہیں سارے چہرے نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک پھیکی پھیکی سی میری خودکشی کی تحریر آہستہ آہستہ اُبھر رہی ہے.....!''

تب دوپہر تھی.....!!

☆☆☆

Na Jhukne wala tana by Prof. Aslam Jamshedpuri (Head, Dept. of Urdu, C.C.S. University,Meeraut) cell-8279907070

پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر، شعبہء اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

نہ جھکنے والا تنا

اس کے گھر میں کئی دن سے فاقے تھے۔ایسے میں رمضان کا مہینہ آ گیا۔میاں بیوی اور دو بچے۔بس یہی اس کا خاندان تھا۔اس کی بیوی عائشہ بہت صبر دار تھی۔وہ اللہ کی رضا میں راضی تھی۔وہ کسی طرح بچوں کا پیٹ بھر رہی تھی اور دونوں میاں بیوی کبھی باسی روٹی، کبھی بچوں سے بچی کھچی بانٹ کر کھا لیتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے۔

بات یہ نہیں تھی کہ وہ ناکارہ تھا۔وہ ایک رئیس کا ڈرایور تھا۔وہ روزانہ اپنے کام پر وقت سے جاتا، دن بھر رئیس کے ساتھ رہتا۔وہ جہاں کہتا، وہ کار سے اسے لے جاتا۔اس کی شہر میں چار فیکٹریاں تھیں شہر کے پاش علاقے میں اس کا شاندار آفس اور گھر تھا۔نوشاد روز پابندی سے اپنے کام پر جاتا۔بڑی مشکل سے اس کی گذر بسر ہو رہی تھی۔اسے کل پندرہ ہزار روپے ماہانہ ملتے تھے۔بچے سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے۔تنخواہ کے پیسے کھانا، کپڑا اور مکان کے کرائے میں خرچ ہو جاتے۔کسی ماہ اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تو ادھار کی نوبت آ جاتی۔ابھی پچھلے ماہ ہی اس نے اپنے مالک سے پانچ ہزار روپے ادھار لئے تھے۔اس کی بیٹی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔اس نے کئی بار کوئی اور کام کرنا چاہا لیکن وہ ناکام رہا۔اس کی اس حالت سے اس کا مالک واقف نہیں تھا۔

حشمت علی شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔اس کی کئی فیکٹریاں تھیں۔اس کے پاس بے شمار دولت تھی۔وہ بہت نیک دل اور خدا ترس بھی تھا۔ہر ماہ ہزاروں اور لاکھوں روپے وہ غریبوں اور معذوروں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔وہ پابندی سے زکوٰۃ اور صدقات دیتا تھا۔رمضان کا مہینہ آیا تو اس نے غریبوں میں مہینے بھر کا راشن بانٹنے کا منصوبہ بنایا۔وہ ہر روز اپنی بڑی سی کار میں راشن لوڈ کرواتا اور نوشاد کے ساتھ جا کر غریب بستیوں اور فٹ پاتھ والوں میں بانٹ آتا۔ابھی رمضان کے دو تین روزے ہی گذرے تھے۔حشمت علی عیدگاہ کے بڑے شیڈ میں روزانہ غریبوں کے افطار کا بھی انتظام

کرتا۔وہ وہاں مردوں اور عوتوں کا الگ الگ انتظام کرتا۔افطار میں مختلف طرح کے پھل ،کھجور،مسالے دار چنے ،پکوڑیاں اور شربت کا اہتمام ہوتا۔انتظام میں اس کے نوکر چاکر اور عیدگاہ کمیٹی کے لوگ مستعدی سے لگے رہتے۔کبھی کبھار وہ بھی عیدگاہ میں افطار کرتا کہ پتہ لگائے انتظام ٹھیک ہوتا ہے کہ نہیں۔نوشاد،حشمت علی کے ساتھ ہمیشہ ہوتا۔کپڑے تقسیم کرنے ہوں،راشن بانٹنا ہو ،اسپتال میں پھل تقسیم کرنا ہو یا کسی غریب کو پیسوں سے مدد کرنی ہو۔نوشاد ہمیشہ حشمت علی کے ساتھ ہر تقسیم کے وقت ہوتا،اس کی وجہ حشمت کا نوشاد پر بے انتہا اعتماد تھا۔نوشاد کے گھریلو حالات سے حشمت واقف نہیں تھا۔

نوشاد کبھی چار بجے تو کبھی پانچ بجے حشمت کو گھر پہنچا کر فارغ ہو جاتا۔حشمت کو اگر کسی ایمرجینسی میں کہیں جانا ہوتا تو اس کا بیٹا کار چلاتا یا وہ خود کار چلا لیتا۔نوشاد کی گھریلو حالت ٹھیک نہیں تھی۔اس کی بیوی عائشہ کسی طرح گھر کا خرچ چلا رہی تھی۔وہ بازار سے سڑے گلے پھل بہت کم قیمت پر لے آتی ۔پھل کے خراب حصے کاٹ کر الگ کرتی اور اپنے بچوں کو کھلاتی۔ایک دن عائشہ نے اس سے اپنے مالک سے ایڈوانس میں کچھ پیسے مانگنے کو کہا۔

''دیکھو جی۔۔۔ایک بات کہوں؟''

''جی۔۔بولو نا۔۔''وہ جانتا تھا کہ وہ کیا بولے گی۔

''اپنے مالک سے کچھ پیسے ادھار لے لو۔۔گھر میں آٹا بالکل ختم ہو رہا ہے۔دال چاول بالکل ختم ہو گئے ہیں۔۔مہینہ پورا ہونے میں ابھی دس دن باقی ہیں۔۔''

''میں کوشش کروں گا۔۔۔''اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔وہ جلد ہی وہاں سے چلا آیا۔

آج حشمت علی نے بڑی گاڑی نکالنے کو کہا تھا۔بہت سارا راشن غریبوں کو تقسیم کرنا تھا۔ایک غریب بستی میں جب گاڑی داخل ہوئی تو کالی پیلی شکلوں والی عورتیں،کمزور و لاغر بوڑھے ،کسی کا ایک ہاتھ کٹا ہوا،کسی کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی ،مردوں نے گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔نوشاد نے گاڑی روکی۔نیچے اتر کر سب کو قطار لگانے کو کہا۔طاقتور آگے آگئے۔اس نے پیکٹ بانٹنے شروع کئے۔ہر ایک پیکٹ میں دس کلو آٹا،پانچ کلو چاول ،دو کلو چینی ،دو لیٹر تیل ،کھجور کا ایک پیکٹ ،دو کلو بیسن اور کچھ مصالحے تھے۔نوشاد نے ایک ایک پیکٹ قطار والوں کو دینا شروع کیا۔پیکٹ بانٹتے بانٹتے اسے اپنے گھر کی یاد آگئی۔

عائشہ نے آج مالک سے ادھار لانے کو کہا تھا تاکہ راشن آسکے۔آٹا،چاول،چینی،تیل

،پھل، دالیں، مصالحے وغیرہ۔اس نے ایک بار کو سوچا بھی کہ کسی طرح حشمت علی کے پیکٹوں میں سے ایک پیکٹ بچالے۔حشمت علی پوچھے تو کہہ دے مجھے بھی پیکٹ کی ضرورت ہے۔گھر کا تمام راشن اس پیکٹ میں بند تھا۔مانو اس کی قسمت اور خودداری اس پیکٹ میں بند ہو۔بیوی بھی خوش ہو جائے گی اور بچوں کا دل بھی بہل جائے گا۔ان کے دوستوں کے گھر اچھی اچھی افطاری بنتی ہے۔ایک بار معصوم بیٹے نے اس سے کہا تھا، جو ابھی پانچ سال کا ہی تھا۔

'' پا پا ۔۔میرے کئی دوستوں کے یہاں فروٹ چاٹ ،کئی طرح کی پکوڑیاں، مٹھائیاں، مرغے کی پکوڑیاں، طرح طرح کے شربت روز بنتے ہیں۔پاپا یہ مرغے کی پکوڑیاں کیسی ہوتی ہیں؟''

''اچھا بیٹا۔۔اللہ سے دعا کریں۔وہ ہمیں بھی اچھا اچھا افطار کرائے گا''

اس کا اپنے بیٹے سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔بعد میں وہ اور عائشہ بہت روئے۔

ایک پیکٹ نیچے گر پڑا تھا، وہ بھی ماضی سے گرتا پڑتا حال میں آ گیا۔گاڑی میں اب صرف تین پیکٹ باقی تھے۔جبکہ لینے والے چار تھے۔اس نے رعب گانٹھتے ہوئے دو پیکٹ بانٹے اور ایک بچالیا۔اور گاڑی کی ڈگی بند کر دی۔

''چلو، چلو۔۔اب کل آنا۔۔''

اس نے لوگوں کو تیز آواز میں کہا اور اسٹیرنگ سیٹ پر آ گیا۔پیکٹ تقسیم کرنے میں اسے آدھا گھنٹہ لگ گیا ہوگا۔حشمت علی اگلی سیٹ پر بیٹھا بیٹھا ہی سو گیا تھا۔گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی۔نوشاد نے گاڑی آگے بڑھانے کو گیئر ڈالا ہی تھا کہ حشمت علی کی آواز بلند ہوئی۔

''نوشاد۔۔گاڑی روکو۔۔''

نوشاد نے مالک کا حکم بجاتے ہوئے گاڑی روک دی۔حشمت گاڑی سے اترا۔غریبوں نے اسے گھیر لیا تھا۔وہ راشن مانگ رہے تھے۔نوشاد بولا۔

''سر میں نے ان سے کل کے لئے کہہ دیا ہے۔۔ہم کل پھر ادھر آئیں گے''

''نہیں نوشاد جو بچ گئے ہیں ،انہیں پیسے دے دو۔۔ہم کل دوسری طرف جائیں گے ۔۔اور ہاں ذرا ڈگی کھولو۔۔''

مرتا کیا نہ کرتا۔اس کی حالت بینک کے اس کیشئر کلرک کے مصداق تھی ، جو اپنے ہاتھوں لاکھوں روپے بانٹتا ہے،مگر اپنی انتہائی ضرورت کے لئے بھی ،ایک روپیہ تک نہیں لے سکتا۔اس کے

گھر کی حالت غیر تھی۔مگر اس کے اندر خودداری تھی۔وہ اپنے مالک سے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔حشمت علی نے کونے میں پڑے آخری پیکٹ کو نکالا۔

''ارے نوشاد۔۔اس میں تو ایک پیکٹ پڑا ہے۔۔''

اس نے وہ پیکٹ ایک غریب عورت کو دے دیا، باقی لوگوں کو اس نے ہزار ہزار روپے دئے۔سب کو رخصت کر کے وہ گاری پر بیٹھ گیا اور بولا۔

''نوشاد اب چلو۔۔۔گھر کی طرف لے لو۔۔''

نوشاد کے ارمانوں کی دنیا پل بھر میں ریزہ ریزہ ہوگئی تھی۔وہ خاموش گاڑی چلاتا رہا۔کچھ دیر بعد وہ ڈرتے ڈرتے مالک سے بولا۔

''مالک۔۔۔مجھے اس ماہ کی تنخواہ سے دو ہزار روپے ایڈوانس دے دو''

''نوشاد ابھی بیس دن پہلے تو تمہیں پانچ ہزار روپے دئے تھے۔تنخواہ پر لینا۔۔بار بار مجھے تنگ نہ کرو۔''

نوشاد خاموش ہوگیا۔اسے بہت امید تھی کہ حشمت علی اسے ضرور پیسے دے دے گا۔۔مگر اس کا جواب سن کر وہ بت بن گیا تھا۔ایسا بت جو بے لباس ہوتا ہے۔جو بے احساس ہوتا ہے۔اسے گرمی سردی، بے عزتی، بے شرمی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔جس کے درد کے نہ خوشی کے آنسو نکلتے ہیں۔وہ بار بار درخواست کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ایسا نہیں تھا کہ حشمت علی برا انسان تھا بلکہ وہ جانتا تھا کہ نوشاد کی حالت ٹھیک ٹھاک ہے۔نوشاد نے کبھی رو، گا کر خود کی حالت نہیں بتائی تھی۔اسے لگتا تھا کہ اس کی بھی کچھ عزت ہے، وقار ہے۔

حشمت علی کا جواب سن کر اس کے چہرے پر مایوسی اور نا امیدی کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔اسے اپنی بیوی اور بچے یاد آرہے تھے۔ان کی خواہشیں اور تمنائیں دم توڑتی نظر آرہی تھیں۔گھر پہنچ کر اس نے گاڑی پارک کی اور مالک کو سلام کر کے رخصت ہولیا۔ابھی افطار کا وقت ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔اسے اپنے گھر پہنچنے میں آدھا پون گھنٹہ لگتا تھا۔گھر پہنچا تو بیوی کے سوالات نے اسے ایسے گھیر لیا جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے میں جمع ہوتی ہیں۔

''کیا ہوا پیسے ملے؟''

''افطار کا سامان لائے؟''

''راشن پورا لے آئے نا''

وہ سوالات کے حملے سے گھبرا گیا۔اس نے جواب کی جگہ جگہ سے پھٹی چادر اوڑھ لی،اس کے منھ سے نکلا۔

''نہیں۔۔کچھ بھی نہیں۔۔''

اس کے جواب نے عائشہ کے جوش اور امیدوں پر پانی پھیر دیا۔وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔نوشاد کے چہرے کی مایوسی کا رنگ،اس کی بیوی کی چہرے پہ بھی چڑھ چکا تھا۔وہ اپنے شوہر سے مری ہوئی آواز میں بولی۔

''مجھے آج بہت امید تھی۔تمہارا مالک ضرور تمہیں پیسے دے دے گا،تم آج راشن اور افطاری کا کچھ سامان لاؤ گے۔بچوں کو بھی آج بہت انتظار تھا کہ ان کے پاپا آج طرح طرح کی افطاری لائیں گے۔''

''میں نے ایک پیکٹ اپنے لئے رکھا تھا مگر جب مالک اسے بھی ایک غریب کو دینے لگے تو میں کچھ نہیں بول پایا۔میری ضرورتیں اور فاقے لب نہیں کھول پائے۔راستے میں،میں نے ایڈوانس پیسوں کے لئے بھی کہا۔مگر ان کے جواب نے مجھے پتھر ایک بت بنا دیا،میری خودداری،میری بچی کھچی انا،نے میرے لبوں پر پہرا لگا دایا تھا۔۔میں کیا کرتا؟ کیا میں ان کے آگے گڑگڑاتا،ہاتھ جوڑتا،نہیں۔۔''نوشاد روہانسا ہو گیا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔۔جیسی اللہ کی مرضی۔۔ایسا کرتے ہیں آج افطار کے لئے عیدگاہ چلتے ہیں۔بچے بھی ٹھیک سے افطار کر لیں گے اور ہم بھی کئی دن بعد پیٹ بھر لیں گے۔''

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔یہ نہیں ہوگا۔۔کہیں کسی نے دیکھ لیا تو۔۔خاص کر حشمت صاحب نے۔۔''

''وہ کوئی روز تھوڑے ہی آتے ہیں۔۔پھر بچے بھی تو ضد کر رہے ہیں۔ان کی خاطر مان جاؤ۔۔''

''نہیں۔۔مجھ سے نہیں ہوگا۔۔تم جاؤ اور بچوں کو بھی لے جاؤ۔۔''

''میری خاطر۔۔بچوں کی خاطر۔۔اور شائد اللہ کی بھی یہی مرضی ہے۔۔''

دونوں کے آنسو روکے سے نہیں رک رہے تھے۔نوشاد وہاں سے دور چلا گیا اور جی بھر کر رویا۔بادلِ ناخواستہ وہ بیوی بچوں کی خاطر افطار کے لئے عیدگاہ چلنے کو تیار ہو گیا۔گھر کی مفلوک الحالی ،بچوں کے چہرے پر امیدوں کے رنگ اور بیوی کی ترکیب کے آگے اس نے اپنی ضد کو قدموں تلے روندتے ہوئے بیوی کے قدموں سے قدم ملا دیے تھے۔

عیدگاہ میں وہ خود کو چھپائے چھپائے پھر رہا تھا۔اس نے بچے عائشہ کے ہمراہ کر دئے تھے

اور وہ لوگ زنانے کیمپ میں چلے گئے تھے۔نوشاد نے خود کو بھیڑ میں چھپا رکھا تھا۔وہاں اس کے شناسا لوگ نہیں تھے۔اور اکا دکا تھے بھی تو وہ خود کو چھپائے ہوئے تھے۔افطار کا وقت قریب آ گیا ۔صفیں لگ گئیں۔سب کو بٹھایا جانے لگا۔قہراً جبراً وہ بھی ایک صف میں سما گیا۔دور سے دیکھنے پر وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔افطار ہونے میں تین چار منٹ بچے تھے۔اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔اسے خوف تھا کہ کہیں اس کا مالک نہ آ جائے۔سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔حشمت اسے پہچان لے گا۔مگر اسے لگا کہ آج حشمت علی نہیں آیا ہے۔اسے افطار میں رکھی انواع واقسام کی چیزیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔کھجور،شربت،پکوڑیاں،چنے،وہ ان سب سے بے خبر الگ ہی ادھیڑ بن میں غرق تھا۔کہیں آج دیکھ لیا گیا تو پھر کیا ہوگا۔۔؟ مالک کی نظر میں اس کی کیا عزت رہے گی؟ مالک کو سب پتہ چل جائے گا۔کیا ہوا پتہ چل جائیگا تو؟ اچھا ہے۔۔آج اس کے سامنے راز کھل جائے۔اسے احساس تو ہو کہ چگراغ تلے اندھیرا ہے اور وہ پورے شہر کی تاریکی مٹانے چلا ہے۔کیا اسے نظر نہیں آتا؟ کیا میں نے اس سے ایڈوانس نہیں مانگے تھے؟ اور کیا میں روتا گڑگڑاتا؟ بار بار اس کے ہاتھ جوڑتا؟ میں نے تو اپنے لئے ایک پیکٹ بچا بھی لیا تھا۔پر اس نے کیا کیا؟ اس نے کسی اور کو دے دیا۔مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ یہ پیکٹ کیوں بچایا ہے؟ اس وقت تو نیک نامی کا بھوت سوار تھا۔میرے پژمردہ چہرے اور حالتِ غیر کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ ابھی وہ خیالوں میں مگن ہی تھا کہ اس کی سماعت سے اس کا ہی نام ٹکرایا۔

''نوشاد۔۔نوشاد۔۔''حشمت علی حیرانی آوازیں لگا رہے تھے۔

''تم یہاں کیسے؟ ادھر آؤ۔۔''

نوشاد پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔وہ ہلکی ہلکی ٹھنڈ میں بھی پسینے میں تر ہو گیا۔وہ بے لباس ہو گیا تھا۔سارے لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔اس کی بے بسی اور چہرے کی ہوائیوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔

سورج دن بھر کا بھوکا پیاسا مغرب کی گود میں ڈوبنے لگا۔افطار کا سائرن زور سے بجنے لگا اور نظروں نے دیکھا ایک سایہ صفوں کو چیرتا ہوا بھاگ رہا تھا۔کچھ ہی دیر میں وہ اندھیرے کا حصہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

Ped se bichdi shaakh by Najma Usman (Surrey, U.K)

نجمہ عثمان (سرے، یو۔کے) cell-0044-7936911711

پیڑ سے بچھڑی شاخ

شاہ بلوط کے اس پیڑ کی شاخیں چھتری نما انداز میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اوائل بہار میں ہی اس کی ٹنڈ منڈ شاخوں میں ننھے ننھے ہرے پتے نمودار ہو جاتے اور چند ہی ہفتوں میں اس کی تمام شاخیں ہرے پتوں سے لد پھند کر زمین کی طرف یوں لٹک جاتیں جیسے بہار میں کھلنے والے پھولوں کے استقبال کے لئے جھک گئی ہوں۔ گرمیوں بھر اس کی چھتری نما شاخیں گارڈن کے ایک بڑے حصے کو اپنے سائے میں لئے رہتیں۔ اس کے نیچے لگے ہوئے پودوں میں پھول مسکراتے ۔فینس کے ساتھ لگی ہوئی بیلیں والہانہ انداز میں پھیل پھیل کر اس سے لپٹ جاتیں۔ جوں ہی اس کے پتے پیلے پڑنے لگتے صالحہ سمجھ جاتی کہ پت جھڑ کا موسم دستک دینے والا ہے۔ پھر پتے پیلے ہو ہو کر جھڑنے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اور سوکھے پتے نیچے کی کیاریوں کو اس طرح ڈھانپ لیتے جیسے اس کے اجاڑ پن کو چھپانا چاہتے ہوں۔ اس درخت کے سارے موسموں کو صالحہ نے اپنے اندر یوں سمو لیا تھا جیسے وہ بھی اس کی کسی شاخ کا ایک حصہ ہو۔ اس کے ہرے بھرے سائے میں اس کی ازدواجی زندگی کے پچیس سال جیسے چٹکی بجاتے ہی گزر گئے۔ ابھی کل ہی کی بات لگتی تھی جب انہوں نے یہ گھر خریدا تھا۔ بابر دو سال کا اور احمر چار سال کا تھا۔ وہ تو اس گھر کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئی تھی البتہ صالحہ کے میاں انور مجید کو یہ مکان بالکل پسند نہیں آیا کمرے چھوٹے چھوٹے تھے بس ساری خوبصورتی پائیں باغ کی تھی۔ اس وسیع و عریض گارڈن میں لمبا چوڑا لان تھا۔ سیب، ناشپاتی کے درخت تھے اور ان گنت پھولوں کے پودے۔ لیکن سب سے نمایاں یہ اونچا سا شاہ بلوط کا درخت ۔کن مشکلوں سے اس نے انور کو گھر خریدنے پر راضی کیا تھا۔

صالحہ کو باغبانی کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ کبھی کبھی انور اسے چھیڑتے۔ ''یہ تم میں انگریزیت کے جراثیم کہاں سے آ گئے ہیں۔ دروازوں کے ہینڈل چمکانا اور گارڈن کی دیکھ بھال تو یہاں کی مقامی خواتین کی ہابی ہے بلکہ سیکنڈ نیچر بن جاتی ہے''۔ صالحہ ہنس کر ٹال دیتی۔ ہر عورت اپنا گھر سنوارنا اور

سجانا جانتی ہے اور ہر ایک کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ بچے چھوٹے تھے تب بھی وہ گھر کے کام سے فارغ ہو کر گارڈن کا رخ کرتی، ننھا بابر پش چیر میں بیٹھا رہتا اور احمر اس کے اردگرد کھیلتا رہتا۔ دونوں بچے اسکول جانے لگے تو صبح سے تین بجے تک اس کے پاس وقت ہی وقت ہوتا۔ بچے ذرا بڑے ہوئے تو دوستوں کے ساتھ پارک جانے لگے۔ اب ان کی فٹ بال اور کرکٹ کے لئے یہ گارڈن بھی چھوٹا پڑ گیا تھا اور صالحہ بھی ان کی سرزنش کرتی رہتی۔

'دیکھو سنبھال کے۔ گیند اونچی پھینکو۔ ہائے اللہ میرے پھولوں کا پودا توڑ دیا'۔

انور کی دلچسپی گارڈن کے لان تک محدود تھی۔ گرمیوں کے دنوں میں وہ درخت کی چھاؤں میں کرسی ڈال کتاب لے کر کر بیٹھ جاتے۔ اور جب صالحہ بھی اپنے ربر کے دستانے چڑھائے کھرپی ہاتھ میں لئے باہر آجاتی تو وہ اپنی کتاب بند کر کے یا تو اس سے باتیں کرنے لگتے یا پھر اس کی محویت اور لگن کو ستائش آمیز نظروں سے دیکھتے رہتے۔ کس پیار اور احتیاط سے وہ ایک ایک پودے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اکثر پانی دیتے ہوئے ان سے باتیں کرتی۔ ''اوہو یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے'' وہ بزی لزی busy lizzy کے پھولوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی ''وہ تمہارے گہرے گلابی رنگ کہاں گئے۔؟''

پھر انور سے مخاطب ہوتی ''اگلے سال اسے شاہ بلوط کے نیچے لگا دونگی۔ اس کیاری میں تو دھوپ ہی دھوپ بھری رہتی ہے۔'' گلوبل وارمنگ کی وجہ سے جون جولائی میں درجہء حرارت پاکستان کی گرمیوں کو مات دینے لگا تو صالحہ نے گرین ہاؤس پر تیز دھوپ سے بچاؤ کے لئے پردہ ڈال دیا۔ وہ اکثر سوچتی میں کچھ بھی کرلوں ان تمام پھولوں کو پودوں کو ان ہرے بھرے درختوں کو کڑے موسموں کی زد پر تو آنا ہی ہے۔ موسموں کا مزاج بدلنا قانون فطرت ہے۔ موسم خزاں میں جب فینس کیساتھ لگا شاہ بلوط اپنے پتوں کی پوشاک اتار کر برہنہ ہو جاتا تو صالحہ نیچے گرے ہوئے سوکھے پتوں کے ڈھیر کو اٹھا کر کمپوزٹ بنانے والے ڈرم میں ڈال دیتی۔ کئی دفعہ لان کی گھاس کاٹتے ہوئے انور نے اردگرد پھیلے ہوئے سوکھے پتے اٹھا کر کچرے کے بن میں ڈال دئے اور صالحہ اس پر بہت خفا ہوئی۔ ''ہر چیز کی اپنی کوئی نہ کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ گلے سڑی ترکاریوں اور پھلوں سے لے کر سوکھے پتوں تک۔ پھر یہ ری سائیکل اسی لئے تو کیا جاتا ہے۔۔۔'' اور اس کی کمپوسٹ بنانے کی تھیوری کو سننے سے پہلے ہی انور فوراً کانوں کو ہاتھ لگاتے کہ آئندہ وہ ایک پتہ بھی نہیں اٹھائینگے۔

اس خزاں آلود شام کو وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سوکھے پتے جمع رہی تھی اور پھر ایک ہاتھ کو زمین پر

ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کی تو کمر میں درد کی ایسی لہر اٹھی کہ اس کی بیساختہ چیخ نکل گئی۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھ سکی اور کمر کو پکڑے پکڑے گھر کے اندر گئی۔ انور گھر پر نہیں تھے۔ اور بچے۔۔۔ بچے کہاں رہے تھے۔ احمر ڈاکٹر بن گیا تھا اور گھر سے بہت دور ویلز کے اسپتال میں پریکٹس کر رہا تھا۔ چار سال ہو گئے تھے اسکی شادی کو۔۔ اس کی اپنی پسند تھی۔ لڑکی بھی ڈاکٹر تھی۔ صالحہ اور انور نے سمجھدار والدین کا رول نبھایا۔ مغربی ممالک میں اکثر ایشیائی ماں باپ اپنی پسند زبردستی بچوں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ نئی نسل کے اس مغربی ماحول میں کیا مسائل ہیں۔ کیا ضروریات ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے سوچنے سمجھنے اور زندگی کو برتنے کا انداز کتنا مختلف ہے۔ صالحہ اور انور مطمئن تھے کہ بچوں کی خوشی میں ان کی خوشی تھی۔ اب تو احمر کے دو بچے تھے۔ اور دونوں کی پیدائش پر صالحہ اور انور نے ویلز جا کر پوتا۔ پوتی کو دیکھا۔ احمر بھی چھٹیوں میں فیملی سمیت لندن کا چکر ضرور لگاتا تھا۔

بابر ایک بینک میں مینیجر تھا۔ اور چھوٹا ہونے کے ناطے تھوڑا لاپرواہ تھوڑا ضدی۔ لیکن ماں باپ کا بیحد خیال کرتا تھا۔ احمر کے ویلز جانے کے بعد اس میں اپنے آپ ہی ایک طرح کی خود اعتمادی اور ذمہ داری کا احساس جاگ اٹھا تھا۔ شادی ابھی وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ انور انجائنا کے پرانے مریض تھے اور بابر نے زبردستی انہیں جلدی ریٹائر مینٹ دلوادی۔ یہ کہہ کر کہ بس اب گھر پر آرام کریں۔ صالحہ نے تو پڑھی لکھی ہونے کے باوجود کبھی ملازمت نہیں کی۔ چھ مہینے ہوئے بابر نے بھی سنٹرل لندن میں فلیٹ خرید لیا تھا کیونکہ اس کا سارا کام وہیں ہوتا تھا۔ وہ دیر سے گھر آتا اور صالحہ اس کے انتظار میں جاگتی رہتی۔ اب وہ ویک اینڈ پر گھر آتا اور گھر کے بہت سے کام کر دیتا۔ صالحہ اور انور خوش تھے کہ ان کے دونوں بچے اپنے اپنے طور پر سیٹل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی اہمیت اور ضرورت کو کبھی اپنے بچوں پر مسلط نہیں کیا۔ انور کی اچھی خاصی پینشن تھی اور اب مکان پر بھی کوئی مارگیج نہیں تھا۔ آرام سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ احمر نے کئی بار چاہا کہ والدین کو اپنے پاس بلا لے لیکن دونوں تیار نہیں ہوئے۔ پھر ان کی خود مختار اور خوددار طبیعت سے واقف ہوتے ہوئے اس نے یہ تقاضا کرنا بھی چھوڑ دیا۔

انور نے ریٹائرمنٹ کے بعد مطالعے کو اپنا مشغلہ بنا لیا تھا۔ وہ صبح ناشتے کے بعد مقامی لائبریری کا رخ کرتے اور دو تین گھنٹے وہاں گزار دیتے صالحہ کو ایک جگہ بیٹھے رہنے کی عادت نہیں تھی اور بند جگہوں سے ہمیشہ گھٹن محسوس کرتی تھی۔ سردی ہو یا گرمی وہ باہر ضرور نکلتی۔ شام کو دونوں اکٹھے بیٹھ کر ٹی

وی دیکھتے یا پھر ملنے ملانے کے لئے نکل جاتے۔اس خزاں آلود شام کو درد کی شدت سے نڈھال ہو کر، صالحہ کو پہلی بار اپنے گھر کی تنہائی سے خوف محسوس ہوا۔نہ جانے کتنی دیر وہ گرم پانی کی تھیلی کمر سے لگائے اور درد کم کرنے والی گولیاں کھائے پڑی رہی۔درد کم ہوا تو ہاتھ منہ دھونے اٹھی۔سامنے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔زندگی کے زرد موسم نہ جانے کس چور دروازے سے اس کی عمر کے آنگن میں بسیرا کر چکے تھے۔وقت کی تیز دھوپ، پاؤں سے رینگتے رینگتے اب سر تک آ پہنچی تھی۔گویا بڑھاپا پوری طرح اپنے قدم جما چکا تھا۔انور دوپہر کو گھر لوٹے تو اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے اور سمجھانے لگے 'اب تمہاری وہ صحت نہیں رہی جو بیس برس پہلے تھی۔یہاں کی یوروپین عورتوں سے مقابلہ مت کرو۔ان کا جسم اور ذہن دونوں مشقت کے عادی ہوتے ہیں۔لیکن تمہارا کمزور جسم تمہارے ایکٹیو ذہن کا ساتھ نہیں دے پائے گا۔' صالحہ چپکی سنتی رہی۔بابرو یک اینڈ پر آیا اور ماں کی تکلیف دیکھ کر پریشان ہو گیا۔زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔اس نے بھاری چیزیں اٹھانے اور جھکنے کے لئے منع کیا اور ساتھ ہی ساتھ مزید کچھ اور دن آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

بابر اور انور دونوں کی مشترکہ رائے تھی کہ صالحہ باغبانی کے مشغلے کو خیر باد کہے۔اور باغ کی دیکھ بھال کے لئے گارڈنر رکھ لیتے ہیں۔''ہرگز نہیں'' صالحہ دہل کر بولی ''اللہ نہ کرے میں ابھی اپاہج نہیں ہوئی ہوں۔اور میرا ایک ہی شغل ہے اسے مجھ سے مت چھینو۔میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ احتیاط رکھونگی۔'' باپ بیٹے ایک دوسرے کو دیکھ کر چپ ہو گئے۔صالحہ واقعی کچھ دن باہر گارڈن میں نہیں نکلی۔ موسم بھی خراب ہو رہا تھا دو دن سے سرد ہواؤں کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔

اس دن کھڑکی سے پائیں باغ میں جھانکا تو ہر طرف سوکھے پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔اچھی طرح پہن اوڑھ کر وہ باہر نکل گئی۔یہ سوچ کر کہ انور کے آنے سے پہلے واپس گھر میں گھس جاؤنگی۔کام بہت تھا، پتے اٹھانے اور کیاریاں صاف کرنے میں وہ اتنی محو ہوئی کہ جب انور سامنے آ کر کھڑے ہوئے تو اسے وقت کے گزرنے کا پتہ چلا۔اس دن زندگی میں پہلی بار انور کو صالحہ کی اس حرکت پر بری طرح غصہ آ گیا۔''تم آخر چاہتی کیا ہو؟ اسی طرح ضد کرو گی۔سردی کھاؤ گی تو بستر سے لگ جاؤ گی اور یہاں کون بیٹھا ہے جو تمہاری دیکھ بھال کرے گا۔میں احمر کو بلاتا ہوں۔وہی تمہیں سمجھائے گا۔میری اور بابر کی تو تم کوئی بات نہیں مانتیں۔''

صالحہ واقعی لاجواب ہو گئی اور ڈر بھی لگا۔کہیں گر گرا پڑی اور ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تو کون بھگتے گا۔وہ گارڈنر رکھنے پر تیار ہو گئی لیکن اس شرط پر کہ سارا کام اس کی نگرانی میں ہوگا۔گارڈنر ہفتے میں دو

گھنٹے کے لئے آتا۔ کام بھی اچھا کرتا تھا لیکن باتونی بہت تھا۔ صالحہ کرسی ڈال کر بیٹھ جاتی اور اسے ہدایات دیتی رہتی۔ ساتھ ہی ساتھ پھولوں اور پودوں کی نشونما پر بھی گفتگو رہتی۔ اس طرح ایک گھنٹے کا کام دو گھنٹے میں ہوتا۔ مارچ کا مہینہ تھا شاہ بلوط کے درخت کی شاخیں ہرے ہرے پتوں سے لدی ہوئی تھیں۔ لالے اور نرگس کے پھول کیاروں میں جگہ جگہ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اوائل بہار کا طلسم پوری طرح سے باغ کے کونے کونے کو اپنے سحر میں لئے ہوئے تھا۔ انور بڑی دیر سے شاہ بلوط کے نیچے کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہے تھے۔ صالحہ تھوڑے فاصلے پر اسٹول پر بیٹھ کر گملوں میں پھولوں کے بیج بو رہی تھی۔ بیج ۔۔جن سے مٹی کی نمی اور دھوپ کی حرارت پا کر زندگی پھوٹتی ہے۔ اس نے دو چار بار پلٹ کر انور کی طرف دیکھا۔ اسے لگا وہ بڑی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے ہیں۔ آواز دی جواب نہ ملنے پر قریب جا کر ہلایا تو ان کا بے جان ہاتھ اس کے ہاتھ میں جھول گیا۔

اس اچانک ذہنی شاک سے وہ ایک طویل عرصے تک صاحب فراش رہی۔ اس کے اردگرد بہت کچھ ہوتا رہا۔ بابر نے فلیٹ کرایہ پر دے دیا تھا اور گھر میں رہنے لگا تھا۔ احمر اپنی فیملی سمیت مستقل طور پر لندن آ گیا تھا اور وہاں کے مقامی اسپتال میں کام کر رہا تھا۔ پوتا پوتی اس کے اردگرد منڈلاتے رہتے۔ دادی کو کیا ہو گیا ہے چپ چپ رہتی ہیں گارڈن میں بھی ہمارے ساتھ نہیں کھیلتیں۔ ان کے ننھے منے ذہن یہ سوال پوچھتے۔ اس دن دھوپ چمک کے نکلی۔ جون کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کے پوتا پوتی زبردستی اس کو باغ میں لے گئے۔ شاہ بلوط کے درخت کی ہر ڈالی پتوں سے لدی زمین کی طرف جھکی جا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے باغ کا ہر پھول اور پودا اسے دیکھ کر اداس سے تھے۔ ایک عجیب سی خاموشی اور پراسرار سا سکوت تھا۔ وہ درخت کے نیچے کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ یہ انور کی پسندیدہ جگہ تھی۔

بچے اس کے پاس بیٹھ کر کھیلنے لگے۔ کبھی یہاں بابر اور احمر کھیلا کرتے تھے۔ کتنا شور مچاتے تھے اور انور کہتے تھے یہی شور تو زندگی کی علامت ہے۔ پھر اسی شور اور ہنگامے سے نکل کر وہ کتنی خاموشی سے چل دئے۔ نہ کچھ کہا نہ سنا۔ بڑی زیادتی کی تھی انور نے۔ امی! امی! بابر بڑی دیر سے اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں۔ میں کہاں ہوں۔ سب چاروں طرف جمع تھے۔ چلئے اندر چلیں یہاں نہ بیٹھیں۔ سب اسے گھیر کر اندر لے آئے۔ سب گھر والے پریشان تھے۔ احمر کی بیوی شازیہ کہہ رہی تھی۔ ''امی کو اس ماحول سے اس گھر سے دور لے جانا ہوگا۔ خاص طور سے گارڈن میں تو بالکل نہیں جانے دیں۔ اور اس درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ کتنی اپ

سیٹ ہوگئیں۔کیا خیال ہے احمر! انہیں کچھ عرصے کے لئے اینٹی ڈپریشن گولیاں دینے کے بارے میں؟''''میں بھی یہی سوچ رہا تھا'' احمر کے لہجے میں پریشانی عیاں تھی۔''بٹ یونو! وہ کبھی بھی ان دونوں باتوں کے لئے تیار نہیں ہونگی۔میں انہیں جانتا ہوں آخران کا بیٹا ہوں''۔

''تو کیا کیا جائے''؟۔بابر بے بسی سے بولا۔''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔فیوچر کیسے پلان کیا جائے''۔''میرے نزدیک تو اس کا ایک ہی حل ہے۔بابر تم اپنے فلیٹ میں رہو۔میں نے شازیہ سے کافی ڈسکس کیا ہے۔بہتر یہی ہے کہ ہم بچوں کے ساتھ ان کے پاس رہیں۔اور گارڈن کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔امی سے پوچھ کر دیکھتے ہیں۔بچوں کے لئے ایکسٹینشن (extension) تو بنوانی پڑیگی۔ویسے بھی گارڈن بہت بڑا ہے۔بعد میں لان کا جو حصہ بچے گا اس کے اردگرد بجری ڈلوا کر گملے رکھ دینگے تاکہ وہ تھوڑی بہت گارڈننگ کرسکیں۔'' احمر کی باتیں سن کر شازیہ اور بابر سوچ رہے تھے' کاش امی مان جائیں'

صالحہ نے بیٹوں کی ہر بات مان لی' تمہارا اپنا گھر ہے جو چاہے کرو۔بس ایک کیاری چھوڑ دینا۔پھولوں کو اصلی نشونما کی چیزیں زمین سے ملتی ہیں۔گملوں میں وہ بات کہاں۔' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی'۔اپنی زمین ہو اور سایہ کے لئے چھت ہو۔بس کافی ہے۔'انور کا کہا ہوا جملہ اسے یاد آ گیا۔ صبح وہ دیر تک سوتی رہی۔شازیہ کے کہنے پر نیند کی گولی کھا کر جو لیٹی تو دن چڑھے مشین کی گھر گھر سے آنکھ کھلی۔آواز گارڈن سے آرہی تھی۔یہ لڑکے کیا کرنے لگے۔سوچتے ہوئے اس نے کھڑکی کا پردہ اٹھایا۔شاہ بلوط کا لمبا چوڑا درخت اپنی شاخوں سے محروم ہوگیا تھا۔اور اس کے تنے کا اوپری حصہ کٹ کر نیچے گرنے والا تھا۔وہ بے اختیار زینہ اتر کر باہر گارڈن کی طرف لپکی۔''۔اسے مت کاٹو۔اسے مت کاٹو''

اس کی چیخ نما آواز پر گارڈن میں کھڑے ہوئے دونوں بیٹے اس کی طرف دوڑے۔ان کا سہارا لیتے ہوئے اس نے بیچارگی سے زمین پر پڑے ہوئے شاخوں کے ڈھیر کو دیکھا۔شازیہ بھی باہر آ گئی۔''امی اندر چلیں۔آپ کو آرام کی ضرورت ہے''''کونے میں کھڑا ہوا یہ درخت تمہارا کیا لے رہا تھا۔اسے کیوں کاٹا؟ ''صالحہ بے بسی سے رو دی شازیہ بڑی دیر تک اسے سمجھاتی رہی''یہ درخت ہمیشہ آپ کو پاپا کی یاد دلاتا پھر اس سے گرنے والے پتوں سے کتنی گندگی ہوتی ہے۔اور آپ کو پریشانی ہوتی کہ انہیں کون اٹھائے گا۔گارڈنر بھی تو اکثر غائب ہوجاتا ہے۔'' وہ صالحہ کا ہاتھ سہلاتے ہوئے سوچ رہی تھی ابھی امی نے پاپا کی موت کو تسلیم نہیں کیا ہے اس لئے وہ ان سے جڑی ہوئی ہر چیز کو

سنبھال کے رکھنا چاہتی ہیں۔

بچے باہر سے کھیلتے ہوئے اندر آ گئے۔صالحہ کی ننھی پوتی نے ایک کٹی ہوئی شاخ اسے دیتے ہوئے کہا''دادی!اسے گملے میں لگا دیں پھر یہ اتنا بڑا ہو جائے گا''اس نے دونوں بازوؤں کو کھول کر اپنے ہاتھ پھیلا دئے۔صالحہ ٹوٹی ہوئی شاخ کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔اس پر لگے ہوئے ہرے بھرے پتے اب بے جان ہو چلے تھے۔وہ سوچ رہی تھی۔کیا میں بھی اس ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ہوں اور وہ درخت بھی تو نہیں رہا جو زندگی کے سارے بدلتے ہوئے موسموں میں میرا ساتھ دیتا تھا۔ پیڑ سے کٹ کر اس شاخ کا اپنا کوئی وجود نہیں تھا، پہچان نہیں تھی۔ باہر باغ میں ٹری سرجن احمر سے کہہ رہا تھا'میں نے نیچے کا تھوڑا سا تنا چھوڑ دیا ہے لیکن اب یہ مر چکا ہے اور کبھی ہرا بھرا نہیں ہوگا۔۔۔۔۔

☆☆☆

Kanpur se wapsi by Fazil Shafi Butt(Annatnag)cell-9419041002
فاضل شفیع بٹ (اکنگام، انت ناگ)

کانپور سے واپسی

ایک زوردار چیخ ہسپتال کے در و دیوار سے ٹکرا کر گونج اٹھی۔اس چیخ میں درد و کرب تھا۔وہ پچھلے دو ماہ سے کوما میں بے سدھ لاش کی مانند ہسپتال کے ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔اس کی غیر متوقع چیخ سے جاوید ششدر رہ گیا۔سمرن نیم مردہ حالت میں زور زور سے چلا رہی تھی:

"ابو۔۔۔۔مما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کہاں ہیں آپ؟"

جاوید سمرن کے سرہانے بیٹھ کر اس کو جھوٹی تسلی دیتا رہا۔لیکن سمرن پاگلوں کی طرح اپنے ماں باپ کا پوچھ رہی تھی۔آج سے دو ماہ قبل سمرن اپنے والدین کے ہمراہ پکنک پر گئی تھی۔واپسی پر ان کی گاڑی کے ساتھ ایک دل گزار حادثہ پیش آیا، جس میں سمرن کے والد اور ان کی والدہ کی موقع پر ہی موت واقع ہوئی تھی اور سمرن کو تشویش ناک حالت میں لا کر ہسپتال میں بھرتی کیا گیا تھا۔آج دو ماہ بعد سمرن نے موت کو شکست دے کر نئے سرے سے دنیا میں قدم رکھا تھا اور اپنی آنکھیں کھولتے ہی وہ اپنے ماں باپ کی ایک نگاہ کے لیے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

جاوید سمرن کے بچپن کا دوست تھا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت بھی کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جاوید پچھلے دو ماہ سے ہسپتال میں سمرن کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا اور آج سمرن کے ہوش میں آتے ہی جاوید خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ڈاکٹر نے سمرن کا باریکی سے معائنہ کیا اور جاوید سے مخاطب ہو کر کہا:

"اللہ کا شکر ہے کہ سمرن مشکل ترین ہیلتھ کنڈیشنز کے بعد بالآخر موت کے منہ سے باہر نکل آئی ہیلیکن جاوید صاحب مجھے یہ کہہ کر بہت دکھ ہو رہا ہے کہ سمرن اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ماں کی ممتا شاید اس کے نصیب کا حصہ نہیں ہے۔خیر سمرن کی یہ نئی زندگی آپ کو مبارک ہو"

ڈاکٹر کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی جاوید کی ساری خوشیاں ایک دم سے ماند پڑ گئیں۔اس کے سجے سجائے خواب گویا پل بھر میں زمین بوس ہو گئے۔

جاوید نے دل پر پتھر رکھ کر سمرن کو اُس دل دوز سڑک حادثے کے بارے میں ساری تفصیلات فراہم کیں اور ساتھ میں سمرن کو یہ بھی بتایا کہ حادثے کی وجہ سے اس کی کوکھ ہمیشہ ویران رہے گی۔ جاوید نے سمرن کو اپنی باہوں میں بھینچ لیا، اس کے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا اور زندگی کے ہر موڑ پر اس کا ساتھ نبھانے کی قسم بھی کھالی۔

ہسپتال سے چھوٹنے کے بعد سمرن ایک دم سے ٹوٹ گئی اور شدید ذہنی کوفت میں مبتلا ہوئی۔ سمرن اب اپنی بڑی بہن اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ چچا کے گھر میں سکونت پذیر تھے۔ حالانکہ ان کا چچا محمد علی ایک شریف النفس آدمی تھا لیکن وہ سمرن کی یادوں سے اس کے ماں باپ کا نقش مٹانے میں ناکام رہا۔ اس ذہنی کوفت سے راحت حاصل کرنے کے لیے محمد علی نے سمرن کو اپنی بڑی بہن کے ہمراہ سیر و تفریح کی خاطر کانپور شہر بھیجنے کا فیصلہ کیا اور سمرن اپنی بڑی بہن شیرازہ کے ساتھ کانپور کے لئے روانہ ہوئے۔

سمرن اور شیرازہ کانپور میں سیر و تفریح سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ سمرن کے غم آلود چہرے پر نکھار آنے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے زندگی کی المناکیوں کے دئے ہوئے گہرے زخموں کو سلنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔

اسی اثناء میں جاوید نے محمد علی کے ساتھ اچھے مراسم قائم کیے۔ جاوید ایک سرکاری ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کے ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جاوید محمد علی کو اپنے فریب میں گرفتار کرنے میں کامیاب رہا۔ کانپور سے واپسی کے چند دن بعد محمد علی کے گھر لڑکی کا ہاتھ مانگنے جاوید کے ماں باپ وارد ہوئے۔

شیرازہ جو سمرن سے ایک سال بڑی تھیں، کافی خوب رو لڑکی تھی۔ اس کا ناک نقشہ دلکش اور تیکھا تھا۔ محمد علی اور جاوید کے والدین نے آپس میں بات چیت کر کے آخر یہ طے پایا کہ جاوید کی شادی شیرازہ سے ہوگی کیونکہ سمرن ماں بننے کی اہلیت کھو چکی ہے۔ دراصل جاوید نے محمد علی کو سمرن کی غیر موجودگی میں حادثے سے جڑی سب باتوں سے آگاہ کیا تھا اور شیرازہ سے شادی کرنے کی اپنی دلی خواہش کو محمد علی کے سامنے رکھا تھا۔

اس دلخراش سڑک حادثے کے باعث سمرن نے اپنے والدین کے ساتھ ساتھ آج اپنی محبت کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ جاوید قطعی نہ چاہتا تھا کہ اس کی شادی ایک بانجھ عورت سے ہو اور پھر زندگی بھر لوگوں کے طعنوں سے اس کا دل چھلنی ہوتا رہے۔

جاوید اور شیرازہ کی شادی ہوئی اور سمرن نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے شہر کا رخ کیا اور شہر میں کرائے کے مکان میں رہنے لگی۔ سمرن کو تنہائی سے لگاؤ ہونے لگا۔ تنہائی نے سمرن کو اپنی آغوش میں لیا۔ سمرن نے روح کی گہرائیوں میں تنہائی کو مسلط کیا اور اپنی ماضی کے دلخراش یادوں کے لمس میں اپنی زندگی بسر کرنے لگی۔

سسرال میں چند ماہ گزارنے کے بعد ہی شیرازہ نے سرکاری نوکری حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ شیرازہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی کہ اچانک اس کو ابکائی محسوس ہوئی۔ آج ڈھیر ساری خوشیوں نے شاید ایک ساتھ جاوید اور شیرازہ کو اپنی تحویل میں لیا تھا۔ شیرازہ کی حاملہ ہونے والی خبر نے گھر میں شادمانی کا ماحول قائم کیا۔ چند ماہ بعد شیرازہ نے ایک خوبصورت لڑکے کو جنم دیا۔

جاوید کا تبادلہ ہوا اور شیرازہ بھی جاوید کے ہمراہ اپنا تبادلہ کرانے میں کامیاب ہوئی۔ دونوں میاں بیوی دوسرے شہر میں عارضی طور منتقل ہوئے۔ اب مسئلہ ننھے بچے کی پرورش کا تھا اور اس وقت شیرازہ کے دل و دماغ میں اپنی چہیتی بہن سمرن کا خیال آیا اور اس نے سمرن کو فون کیا اور کہا:

"سمرن۔۔۔۔۔ میری پیاری بہن۔۔۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہم دونوں کا تبادلہ ہوا ہے۔۔ یونیورسٹی کی بھی چھٹیاں چل رہی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم چند دن یہاں آ کر تب تک میرے بچے کی پرورش کا خیال رکھو جب تک میں کسی نوکرانی کا انتظام کرلوں گی"

"ٹھیک ہے دیدی۔۔۔۔۔۔۔ جیسے آپ کی مرضی۔۔ میں کل ہی شہر آنے کا پروگرام بناتی ہوں" سمرن کے جواب میں اختصار تھا۔

سمرن مجبور تھی۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنی بہن کو انکار نہیں کرسکتی تھی۔

اگلے دن علی الصبح سمرن نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور دوپہر تک اپنی بہن کے گھر وارد ہوئی۔ وہ اپنے بہنوئی سے آنکھیں ملانے سے قاصر تھی حالانکہ شیرازہ، جاوید اور سمرن کے عشق کے داستان سے بالکل ناآشنا تھیں۔ سمرن کو اپنے بھانجے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی۔ شیراز صبح تڑکے ہی اپنے آفس کا رخ کرتی اور سمرن اپنے ننھے سے بھانجے کے ساتھ اپنے دل کو لبھاتی تھی۔

جاوید نے اپنی بیوی کی غیر حاضری میں سمرن پر پھر سے ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ اس کو اپنے ماضی کے وہ حسین دن یاد آ رہے تھے جب وہ سمرن کے عشق میں گرفتار تھا۔ وہ سمرن سے بے انتہا محبت کرتا تھا لیکن دلدوز سڑک حادثے نیان کے محبت کے بیچ ایک ایسی دراڑ پیدا کر دی تھی جو بعد میں ان کی جدائی کا سبب بنی۔ سمرن کو دیکھتے ہی جاوید کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ ایک دن جاوید کے صبر کا

پیمانہ ٹوٹ گیا اور اس نے سیدھے کچن کا رخ کیا، سمرن کو اپنے باہوں میں بھینچ لیا اور بے انتہا پیار کرنے لگا۔ سمرن سٹپٹا گئی لیکن جاوید کی ضد کے سامنے آخر اس نے اپنی ہار کو تسلیم کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے دل میں بھی شاید جاوید کے محبت کی تھوڑی سی چنگاری سلگ رہی تھی۔

جاوید اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ سمرن کبھی ماں نہیں بن سکتی اس لیے دونوں کے درمیان شیرازہ کے در پردہ ایک گھناؤنے رشتے کا آغاز ہوا۔ سمرن شیرازہ کی غیر حاضری میں اپنے بہنوئی کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگی۔ یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا اور بالآخر یونیورسٹی کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی سمرن نے جاوید اور شیرازہ کو خیر آباد کہا۔

سمرن نے کالج جوائن کیا اور چند دن بعد اس کی منگنی عرفان سے طے ہوئی۔ عرفان ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا حالانکہ وہ سرکاری ملازم تو نہ تھا لیکن ایک اچھی خاصی پرائیویٹ کمپنی میں نوکری کر رہا تھا۔ منگنی کو چھ ماہ گزر چکے تھے کہ اچانک ایک دن سمرن کی طبیعت بگڑ گئی۔ سمرن نے ہسپتال کا رخ کیا اور اپنی روداد ڈاکٹر صاحب کو سنانے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے باریکی سے معائنہ کرنے کے بعد سمرن سے مخاطب ہو کر کہا:

"سمرن جی مبارک ہو۔ آپ ماں بننے والی ہیں"

ڈاکٹر کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی سمرن کانپ گئی اور اس پر سکتہ طاری ہوا۔ سمرن بہت گھبرائی ہوئی تھی اس کو پورا یقین تھا کہ وہ ماں بننے کی اہلیت کھو چکی تھی لیکن کارگاہ الٰہی کے فیصلوں سے بھلا انسان کیسے آشنا ہو سکتا ہے؟ وہ چھ ماہ کی حاملہ تھیں۔ سمرن بوجھل قدموں کے ساتھ ہسپتال سے نکلی اور نمناک آنکھوں سے اپنے بہنوئی کو فون کیا اور اس کو اپنی حاملہ ہونے والی بات سے آگاہ کیا۔

"دیکھو سمرن۔۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔۔۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کر لوں گا۔ دین اسلام نے مجھے دو بیویاں رکھنے کی پوری آزادی دی ہے۔ میں تم دونوں بہنوں کو اپنی بیویاں بنانا پسند کروں گا" جاوید کی لہجے میں سنجیدگی تھی۔

سمرن جاوید کا بے تکا جواب سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ کسی بھی حالت میں اپنی بہن کا گھر اجاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جاوید کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور جاوید نے ایک غیر ذمہ دارانہ شخصیت کا ثبوت فراہم کیا تھا اور آج سمرن ایک بار پھر جاوید کی بے وفائی کے سامنے بے یار و مددگار نظر آ رہی تھیں۔

سمرن نے سیدھے اپنے کمرے کا رخ کیا اور زار و قطار رونے لگی۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی اور عرفان

تک اس بات کی بھنک لگنا ان کے رشتے کو ہمیشہ کے لیے دفن کر سکتا تھا۔اس مصیبت کی گھڑی میں سمرن نے اپنی سہیلی نظرانہ کو فون کر کے تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔سمرن رو رو کر اپنی کرتوت اپنی سہیلی کو سنا رہی تھی اور نظرانہ یہ سب سن کر پریشان ہو رہی تھی۔

نظرانہ نے اپنی پیاری سہیلی سمرن کو تسلی دی اور فون رکھتے ہی اپنے منگیتر آصف سے مدد طلب کی۔

آصف پیشے سے ایک ڈاکٹر تھا۔نظرانہ کی منت سماجت کے بعد آصف نے اسقاط حمل کا مشورہ دیا جس کے لیے کچھ پیسوں کا بندوبست کرنا لازمی تھا اور یہ ایک پرخطر عمل تھا جس سے سمرن کو اپنی جان کی بازی بھی لگانی پڑ سکتی تھی۔

سمرن اپنی سونے کی چین بیچ کر اسقاط حمل کے لیے تیار ہو گئی اور نظرانہ کے ہمراہ آصف کے ایک دوست اشرف کے گھر چلی گئی۔آصف نے نظرانہ کے محبت کی خاطر اپنے پیشے سے بے ایمانی کی اور سمرن کا حمل گرانے میں کامیاب رہا۔رات اشرف کے گھر پر ہی بسر ہوئی ۔

اگلے دن صبح سویرے سمرن اشرف اور آصف کے ہمراہ اپنے شہر کے کرائے والے کمرے کی جانب چل پڑی۔تھوڑی مسافت طے کرتے ہی سمرن نے آصف کو گاڑی روکنے کے لیے کہا۔اس کا کوئی دوست اس کا منتظر تھا،جس کو سمرن کے ہمراہ شہر جانا تھا۔

آصف نے گاڑی روک لی اور ایک نوجوان پچھلی سیٹ پر براجمان ہوا۔نوجوان نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔گاڑی اپنا فاصلہ طے کر رہی تھی کہ اچانک شاہراہ پر تعینات پولیس کی ایک ٹیم نے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔آصف نے گاڑی روکی اور زیر لب پولیس کے خلاف کچھ ناشائستہ الفاظ بڑبڑائے ۔سمرن نے تیخ لہجے میں آصف سے مخاطب ہو کر کہا:

"آصف صاحب۔۔۔پولیس والوں کے خلاف کچھ بھی الٹا سیدھا مت بولیے۔میرے ابو بھی پولیس میں تھے مجھ سے قطعی اپنے ابو کی بیعزتی برداشت نہیں ہوگی"

آصف تلملا گیا۔آصف نے تلخ لہجے میں جواب دیا:

"سمرن اگر تم کو اپنی ابو کی عزت کا اتنا ہی خیال ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچ پاتی"

یہ ساری باتیں سمرن کے دوست کی سمجھ سے پرے تھیں۔

آصف نے غصے پر قابو پا کر اپنا سفر جاری رکھا اور ایک آدھ گھنٹے میں شہر پہنچ گئے۔آصف نے گاڑی کو روکا۔سمرن اپنے دوست کے ہمراہ اپنے کرائے کے مکان کی جانب چل پڑی اور آصف کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔

تھوڑی مدت میں سمرن کا دوست واپس لوٹ آیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔آصف نے گاڑی اسٹارٹ کی۔اشرف جو کہ آگے والی سیٹ پر براجمان تھا، نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا:

"ارے بھائی کون ہو آپ؟ راستے میں بھی آپ نے کوئی بات نہیں کی۔۔۔بڑے پریشان لگ رہے ہو "

"جناب میرا نام عرفان ہے۔میں سمرن کا منگیتر ہوں۔میری اس پریشانی کا سبب سمرن ہے۔بیچاری جب سے کانپور سے واپس لوٹ کر آئی ہیں تب سے ان کی طبیعت آئے دن خراب ہی رہتی ہے۔بس کسی طرح سے سمرن کی صحت بحال ہو جائے۔یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ اتنی سیدھی سادھی اور شریف لڑکی سے واسطہ پڑا ہے۔ورنہ آج کل کی لڑکیوں کا خدا ہی حافظ ہے۔۔۔"

آصف اور اشرف چونک گئے۔وہ ایک دوسرے کی طرف حیران کن نظروں سے دیکھنے لگے۔اس کے بعد تینوں نے واپسی میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔۔۔۔۔۔۔!!

☆☆☆

Afsanche افسانچے

Afsanche by Dr. Nazir Mushtaq(M.B.B.S)Srinagar cell-9419004094
ڈاکٹر نذیر مشتاق (ایم۔بی۔بی۔ایس) سرینگر۔cell-9149984865

آن لائن

اچانک فیس بک پر وہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گیے.... وہ ہر رات ایک دوسرے کے ساتھ پیار کی باتیں کرتے تھے۔ انہوں نے خیالوں میں کشمیر کے تمام صحت افزا مقامات کی سیر کر لی.... اب وہ ایک رات ایک ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔ ونود کمار نے تجویز پیش کی.... سونیا.... اب ہم نے خیالوں میں بہت ماہ وسالِ گزارے اب ہم ہوٹل آدم اینڈ ایو میں ایک یادگار رات منایں گے۔ مانو یہ سہاگ رات ہوگی۔ تم دلہن بن جانا اور میں آ کے تمہارا گھونگھٹ ... .او کے.... تم کل وہاں آ جانا میں تمہارا انتظار کروں گا؛؛

دوسرے دن شام کے وقت ونود ہوٹل آدم اینڈ ایو کے سامنے ایک دکان کے پاس کھڑا سگریٹ خرید رہا تھا کہ کسی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی.... ھیلو کیسے ہیں آپ.. واہ کیا لگ رہے ہیں کسی خاص پارٹی میں جانا ہے کیا.... اس کے سامنے راکیش مسکرا رہا تھا۔

ارے جیجا صاحب کیسے ہیں آپ اور ہماری بہنا کیسی ہے.... ونود کمار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہاں آپ کی بہناوہ آج اپنی کسی سہیلی کی شادی میں گئی ہے رات کو وہاں ہی رہے گی۔ لگتا ہے اس کی کوئی غریب سہیلی ہے اس لیے وہ اپنے ساتھ اپنی شادی کا جوڑا اور میک اپ کٹ لے گئی ہے....

بڑا آدمی

خواجہ صاحب میں نے آپ کی بیٹی کے لیے اتنے رشتوں کا انتخاب کیا مگر کوئی بھی رشتہ آپ کو پسند نہیں آیا۔ آخر آپ اپنی نازنیں بیٹی کے لیے کیسا رشتہ چاہتے ہیں.... عبدالجبار ثالث نے

خواجہ سلطان شیخ سے کہا.... مجھے کوئی بڑا ادمی، بہت بڑا ادمی چاہیے۔ یہ ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، رایٹر ،آرٹسٹ، شاعر، موسیقار، سرکاری ملازم وغیرہ میرے کسی کام کے نہیں.... کوئی بڑا آدمی ڈھونڈیے جبار صاحب بہت بڑا آدمی.... ہوں اپ کو بڑا بہت بڑا آدمی چاہیے..... میری نظر میں ایک بہت بڑا آدمی ہے، اس کے پاس چار شاپنگ مال ہیں۔ ایک جوس فیکٹری ہے اور وہ ڈرگس کا کاروبار کرتا ہے..... ہاں۔ خواجہ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے... .اس بڑے آدمی کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتاؤ.... اس کی عمر پچاس سال ہے.... اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں سر پر ایک بھی بال نہیں ہے اور، اور وہ ہر رات شراب نوشی کرتا ہے.... بڑا آدمی شراب نہیں تو کیا لسی پیے گا۔ رہا سوال عمر کا تو کوئی بات نہیں۔ بڑے لوگ اسی عمر میں شادی کرتے ہیں۔ سر پر بال نہیں تو کیا۔ وگ لگایا کرے گا اور چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالے گا بڑا آدمی جو ہے... خواجہ نے ایک ہی سانس میں کہا۔ تو کیا میں رشتہ پکا سمجھوں... جبار نے کہا۔۔ نازنیں کے لیے اس سے اچھا رشتہ کہاں ملے گا۔ اتنی دولت ہے اس کے پاس.... اور کیا چاہیئے۔ تم کل جا کر بات پکی کرلو.... خواجہ نے سگریٹ کا لمبا کش لگاتے ہوئے کہا.... عین اسی وقت پردے کے پیچھے سے نازنیں ظاہر ہوکر کمرے کے وسط میں اگئی اور باپ کی طرف دیکھ کر کہا. ''مجھے یہ رشتہ کسی بھی صورت میں منظور نہیں۔ میں اپنی مرضی سے کسی اعلی تعلیم یافتہ اور ہم عمر نیک سیرت خوب رو نوجوان سے شادی کروں گی۔

نامعلوم

پو پھٹتے ہی لاڈو گرتی سنبھلتی اپنے کوٹھے سے نکل کر سڑک پر آ گئی اور ایک پھلوں سے بھرے ٹرک میں چھپ گئی.... شہر پہنچ کر وہ چلتے چلتے ایک عالیشان عمارت میں داخل ہوئی.... باغ میں کرسی پر ڈاکٹر شبنم آرا اخبار پڑھ رہی تھی.... لاڈو اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''بی بی جی۔ کچھ کھانے کو دو نا بہت بھوک لگی ہے''... لاڈو نے معصومیت سے کہا..... ڈاکٹر۔ کو جانے کیوں اس پر پیار آیا، اس نے نوکر کو آواز دی۔

کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر نے لاڈو سے کہا اب کہاں جاؤ گی ''معلوم نہیں''.... لاڈو نے بالوں کی لٹ کے ساتھ کھیلتے ہوئے کہا.... ''اب تم یہاں میرے پاس رہو.... '' یہ کہہ کر ڈاکٹر شبنم

نے نرس کو آواز دی اور اسے ہدایت دی کہ لاڈو کو لیبارٹری میں کام پر رکھ لے....

تین ماہ بعد ایک صبح ڈاکٹر شبنم نے لاڈو کو غور سے دیکھا تو سوچ میں پڑ گئی....اس نے نرس کو ہدایت دی کہ لاڈو کا ٹیسٹ کرائے....

''لاڈو تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی ہے مگر تم ماں بننے والی ہو۔تمہارے پیٹ میں کس کا بچہ ہے'' لاڈو نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا....

''بی بی جی اس رات نا معلوم بندوق برداروں نے ہمارے چھوٹے سے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا مردوں کو ایک جگہ جمع کر کے گولیوں سے بھون ڈالا اور پھر عورتوں کو نشانہ بنایا....میں اپنے کمرے میں تھی رات بھر ایک ایک کر کے پتہ نہیں کتنے بندوق بردار میرے کمرے میں آئے اور....اب مجھے کیا معلوم میرے پیٹ میں کس کا بچہ ہے....

☆☆☆